قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1959ء

قال اللہ تعالیٰ

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (4/40)

(جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی)

قال الرسول (صلعم)

اِسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ مَا اَقَامَ فِيْكُمْ كِتَابَ اللّٰهِ ۔ (بخاری)

(اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی، جس کا سر کشمش کی طرح (چھوٹا) ہو، امیر بنا دیا جائے، تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق چلائے، اسکی سنو اور اسکی اطاعت کرو)

—:o:—

اسی کو قرآنی نظام کی اطاعت کہتے ہیں جسکی طرف طلوعِ اسلام دعوت دیتا ہے۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے:- آٹھ روپے
غیر ممالک سے:- ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون:- ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵- بی ——— گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۲ | نومبر سنہ ۱۹۵۹ء | نمبر ۱۱

فہرست

معنیٔ انقلاب	۲ — ۳
مقصودِ انقلاب	۴ —
لمعات	۵ — ۱۲
علامہ اقبالؒ کا خط قائدِ اعظمؒ کے نام	۱۳ —
قرآن کریم کے خلاف بہت بڑی سازش	۱۷ — ۲۵
اختلافِ قرأت (علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ)	۲۶ — ۶۹
نقد و نظر	۷۰ —
حقائق و عبر (۱۔ ایک زبردست دلیل ۲۔ حج کا فلسفہ ۳۔ سچی باتیں)	۷۱ — ۷۳
رابطۂ باہمی	۷۵ — ۸۰

(از) حکمتِ فرعونی

حکمتِ ارباب کیں مکر است و فن — مکر و فن؟ تخریبِ جاں، تعمیرِ تن!
حکمتے از بندِ دیں آزادۂ — از مقامِ شوق دُور اُفتادۂ
شیخِ ملّت با حدیثِ دلنشیں — بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں
پستِ فکر و دوں نہاد و کور ذوق — مکتب و ملّائے او محرومِ شوق
از نیاگانِ دفترے اندر بغل — الاماں از گفتہ ہائے بے عمل
منعمانِ او بخیل و عیش دوست — غافل از مغز اند و اندر بندِ پوست
قوتِ فرمانروا معبودِ او — در زیانِ دین و ایماں سودِ او
دینِ او عہدِ دفا بستن بغیر — یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر
از حدِ امروزِ خود بیروں نجست — روزگارش نقشِ یک فردا نہ بست

تا نداند از مقام و منزلش
مرد ذوقِ انقلاب اندر دلش

(اقبالؒ)

حکمتِ کلیمی (تا)

رفتن است

درنگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر — غیرتِ او برنتابد حکمِ غیر
پختہ سازد صحبتش ہر خام را — تازہ غوغائے دہد ایام را
درسِ او، اللہ بس، باقی ہوس — تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس
بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز — ہر کہن معبود را کن ریز ریز
برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم — مرد درویشے نگنجد در گلیم
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام او را، نہ او کس را غلام
بندۂ حق، مردِ آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس
درسِ لاخوف علیہم می دہد — تا دلے در سینۂ آدم نہد

اندر آہِ صبح گاہے او حیات
تازہ از صبحِ نمودش کائنات

(اقبالؒ)

انقلاب

انقلاب کا مقصد

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴)

پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں ملک کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟

انقلاب کا منتہیٰ

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں دیں گے تو یہ

(۱) اس نظام کو قائم کریں گے جس میں تمام لوگ قوانین خداوندی کا اتباع کریں۔

(۲) تمام افراد معاشرہ کے لئے سامان نشوونما مہیا کریں گے۔

(۳) ایسے قوانین نافذ کریں گے جو قرآن کی رُو سے قابل قبول ہوں۔

(۴) ان قوانین و رسوم کو منسوخ کریں گے جنہیں قرآن ناپسند کرتا ہو۔

(۵) غرضیکہ ان کے تمام معاملات اس پروگرام کی تکمیل کے لیے ہوں گے جسے خدا نے نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے تجویز کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

لمعات

نئی اُمیدوں کی بیداری

پاکستان میں عسکری انقلاب، اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آیا تھا۔ طلوعِ اسلام کے اندازے کے مطابق اسے اس سے ایک سال قبل آجانا چاہیئے تھا کیونکہ ہم نے اکتوبر ۱۹۵۷ء میں لکھا تھا۔

> سوال یہ ہے کہ ملک میں تشتت و انتشار کے جو شعلے اس وقت بھڑک رہے ہیں ان کا فوری مداوا کیا ہے۔ اگر ہم جذبات سے الگ ہٹ کر سوچیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس دس سال کے تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ جب زمامِ حکومت نااہلوں اور بدکرداروں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو مملکت کا کیا حشر ہو جاتا ہے۔ اس تجربے سے اب حالات یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ خود اربابِ حکومت ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ ایک ہی پارٹی کا ایک لیڈر کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ۔ ایک ہی کیبنٹ کا ایک وزیر ایک طرف کو جاتا ہے دوسرا دوسری طرف کو۔ وزیرِ اعظم کچھ کہتا ہے اور اس کے وزراء کچھ اور۔ مرکز سے ایک حکم نافذ ہوتا ہے اور صوبہ کا چیف منسٹر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس صورتِ حالات کو کچھ عرصہ کے لئے اسی طرح رہنے دیا گیا تو حکومت کی مشینری میں زنگ کی پھیل جائے گی۔ لہٰذا حالات ہمیں خود بخود اس منزل تک لے آئے ہیں جہاں اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ اس "جمہوری تماشے" کو ختم کر کے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے اور نظم و نسق کو فوج کے مستحکم ہاتھوں میں دیدیا جائے۔

اس انقلاب نے اپنے ابتدائی پانچ چھ ہفتوں میں جو کچھ کیا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اپنی نومبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

> اس تبدیلی کا فوری اور ہنگامی فائدہ تو یہ ہوا کہ عوام کو (جنھیں فی الواقعہ زندگی کے دن کاٹنے دشوار ہو رہے تھے) ضروریاتِ زندگی ملنے لگ گئیں۔ وہ ایک رات کے اندر اس قسم کی خوشگوار تبدیلی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔
>
> دوسرا فوری فائدہ یہ ہوا کہ جن قانون شکن عناصر کے ہاتھوں شریف آدمیوں کے لئے جینا محال ہو رہا تھا، وہ ان کی

دست درازیوں سے محفوظ ہو گئے۔ اب ہر امن پسند شہری اطمینان کا سانس لے رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی کہا تھا۔

لیکن یہ تبدیلیاں بہرحال ہنگامی ہیں۔ ملک کی فضا میں حقیقی اور بنیادی تبدیلی اسی صورت میں آسکتی ہے جب اسے صحیح قسم کا آئین مل جائے۔ اس ضمن میں یہ امر موجب صد اطمینان ہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے بجائے ایک نئے آئین کی تدوین کا سوال موجودہ ارباب حل وعقد کے پیش نظر ہے اور اس کے لئے انھوں نے واضح الفاظ میں اعلان بھی کر دیا ہے۔

جدید آئین کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ

اگر وہ آئین کام کا ہوا تو پھر یوں سمجھئے کہ اس انقلاب نے پاکستان کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا اور جو عجب کہ اس سے دنیا کی تاریخ میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے۔ لیکن اگر وہ آئین بھی کچھ اس قسم کے خطوط پر وضع ہو گیا جن پر سابقہ آئین مدون ہوا تھا تو پھر حالات اس سے بھی بدتر ہو جائیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ارباب حل وعقد کی جہاں بانی و جہاں آرائی کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر ٹسٹ کا موقعہ کبھی نہیں آیا تھا۔

اب عسکری انقلاب کو ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اس دوران میں اس نے جو عملی اقدامات کئے ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سب سے زیادہ اہمیت زرعی اصلاحات کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے زرعی اصلاحات کے نفاذ پر محترم صدر مملکت کی خدمت میں ایک بوقیہ کے ذریعہ ان الفاظ میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا تھا۔

زرعی اصلاحات کے جرأت مندانہ اقدام پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ قرآن کی رُو سے زمین کو عوام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے حکومت کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔ ان اصلاحات نے زمین پر ذاتی ملکیت کی غیر قرآنی اصولوں کی بنیادیں ہلا کر اور رقبوں کی تحدید سے قرآنی نظام کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے اور بے باکانہ اٹھایا ہے۔ اس سے ملک کی معاشی حالت خوشگوار ہو جائے گی اور کمیونزم کا سیلاب رک جائے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ

خدا آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے تاکہ آپ اس آئیڈیالوجی کو جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا عملی حقیقت بنا سکیں۔ اور اس طرح یہ خطۂ زمین اسلامی نہج زندگی کا گہوارہ بن سکے۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۵۹ء)

آپ نے غور فرمایا کہ ہم آئین پاکستان کے اسلامی خطوط پر مرتب ہونے کی اہمیت کو کس طرح مسلسل اور پیہم اجاگر کرتے چلے آ رہے ہیں اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کسی مملکت کے عروج و زوال، بلکہ یوں کہیئے کہ اس کی موت و حیات کا مدار اس کے آئین پر ہوتا ہے۔ اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لئے تو اس سوال کا تعلق موت و حیات سے بھی آگے بڑھ کر کفر و اسلام سے ہے۔ اس ضمن میں ہمارے لئے عسکری انقلاب میں دو تین باتیں خاص طور پر موجب اطمینان ثابت ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس نے ۱۹۵۶ء کے

اس غیر اسلامی آئین کو کالعدم قرار دیدیا جسے اس زمانے کی حکومت نے اسلامی آئین کا لیبل لگا کر ملک کے سامنے پیش کیا تھا اور جس پر علمائے کرام نے اسلامی آئین ہونے کی مہر تصدیق ثبت فرمادی تھی اور ملک میں شادیانے بجائے گئے تھے کہ اب "مملکت مسلمان ہوگئی ہے"۔ ملوکیت اور پیشوائیت کی گٹھ جوڑ کی انسانیت سوز داستانیں یوں تو تاریخ کے ہر دور میں سامنے آتی رہی ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان میں ۱۹۵۶ء کا سانحہ اپنی مثال آپ ہے۔ ملت اور دین سے اس قسم کی غداری کم دیکھنے میں آئی ہوگی۔

دوسری چیز یہ کہ عسکری انقلاب کے ارباب بست و کشاد نے اپنے برسراقتدار آنے کے فوری بعد اس کا اعلان کردیا کہ وہ جلد از جلد ملک میں آئینی حکومت قائم کرنے کے لئے عملی کوشش کریں گے۔ حالانکہ عسکری انقلاب قوت کے زور پر حکومت کرنے کا قائل ہوتا ہے۔ اُسے آئین و دستور سے کچھ واسطہ نہیں ہوا کرتا۔ ہمارے ہاں کا انقلاب جس طرح، دیگر ممالک کے انقلابات سے اس بات میں ممتاز تھا کہ اس نے ایک قطرہ خون بہائے بغیر بساط کہن اُلٹ دی، وہ اس بات میں بھی منفرد ہے کہ اس نے اپنا دائرہ عمل غلط قسم کی حکومت کو برطرف کرنے تک ہی محدود رکھا اور اس کے بعد جدید آئین کی تدوین اور اس کی رُو سے آئینی نظام کی تشکیل کے لئے ملک کو پورا پورا اطمینان دلادیا۔ عسکری نظام کے سربراہوں کی طرف سے یہ اطمینان دہی، ان کی حسن نیت اور خلوص کی بین شہادت ہے۔

تیسری بات اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی ہے اور وہ یہ کہ اس دوران میں صدر مملکت، جنرل محمد ایوب خاں صاحب کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو کچھ سامنے آتا رہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس ملک میں صحیح اسلامی آئین رائج کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ان کے دل میں شدید آرزو اور سچی تڑپ ہے۔ انھوں نے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو باشندگانِ لاہور کی طرف سے پیش کردہ ایڈریس کے جواب میں (گلستانِ فاطمہ میں) کہا تھا۔

> اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بددیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کردیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو داغدار اور زنگ آلود بنادیا تھا جو تشکیل پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد و مطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کردیا جائے کہ انھیں ان کی کھوئی ہوئی چمک دمک اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہوجائے۔ (طلوعِ اسلام۔ جنوری ۱۹۵۹ء)

وہ کونسا فلسفہ تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا؟ اس کی وضاحت خود بانیٔ تحریکِ پاکستان (قائد اعظمؒ) نے کردی تھی جب انھوں نے حیدرآباد (دکن) میں ۱۹۴۱ء میں، اس استفسار کے جواب میں کہ "اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں" فرمایا تھا۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۵۹ء)

محترم صدر مملکت نے ۲ مارچ ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اُس آئیڈیالوجی کا احیاء اور استحکام کریں جس کی رُو سے پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان محض ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف (اور قدامت پرستی کی دلیل) ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجب صد ہزار فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی، بنی نوع انسان سے محبت۔ ہمسایہ سے مودت۔ یتامیٰ کی نگہبانی اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر نہ تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔

پھر انھوں نے (جولائی ۱۹۵۹ء میں) مری میں گورنروں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تبیین، عصرِ حاضر کی زبان میں، زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کو روحِ اسلام سے کشید کیا جائے اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعمیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا نہایت معقول حل دریافت کریں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہوں، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔ (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۵۹ء)

صدرِ مملکت کے ان ارشادات سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ حقیقی اسلام سے متعلق ان کا ذہن بڑا صاف ہے اور اس اسلام کو مملکتِ پاکستان میں ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے ان کے دل میں بڑی تڑپ ہے۔ ان خیالات کا ان کی طرف سے مختلف مواقع پر اظہار ہوتا رہا۔ لیکن انھیں پوری جامعیت کے ساتھ انھوں نے اپنی اس تقریر میں یکجا کر دیا جس سے انھوں نے لنڈو الہ یار میں علماء کے اجتماع سے خطاب کیا تھا۔ اس میں انھوں نے فرمایا۔

کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام نصف دنیائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ (مذہب نہیں تھا بلکہ) ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے

حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جد و جہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔

اس کے بعد انھوں نے کہا۔

جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو دینی رہی اس کے متبعین دنیا سے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گذرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں۔ اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ اسلام اس تفریق (یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد انھوں نے کہا۔

جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی تو بہر حال کسی نہ کسی سمت میں چلتی ہی رہتی ہے۔ لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہونچ چکی ہے لیکن ہمارا مذہب صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو بت بنا دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس کے متعلق انھوں نے فرمایا۔

مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصرِ حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اٹھایا ان پر "دنیادار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی۔ اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ، مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے۔ اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں، انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔

اپنے اس دعوے کی شہادت میں صدر مملکت نے کہا۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی مسجد مسجد میں پڑھے

جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس قسم کے ملبند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن (اور علم و بصیرت کا حریف) بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آجکل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔

اس کے بعد صدر مملکت نے کہا کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا ترقی پسند، زندہ، دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا؟ اس کے جواب میں انھوں نے پہلے اس کی چند وجوہات استفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں۔ انھوں نے کہا۔

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے ہیں اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا؟

(۲) یا ہم نے اپنے دین کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔؟

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے (زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے) ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے؟

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے؟

ان سوالات کو پیش کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔

یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں جنھوں نے اسلام کی برق آسا، شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقین محکم کے ساتھ بیباکانہ انداز سے سرگرم جستجو رہیں۔

اس کے بعد صدر محترم نے فرمایا۔

عالم اسلام کے تشتت و انتشار کا ایک بڑا سبب مذہبی فرقہ بندی ہے۔ غلط یا صحیح، فرقے بہرحال موجود ہیں اور اس حقیقت سے صرف نظر کرنا حماقت ہے۔ اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے کہ کونسا فرقہ حق پر ہے اور کونسا باطل

پر تو اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صحیح طریق یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے اختلافی نکات کو ابھارنے کے بجائے ان امور پر زور دیا جائے جو ان میں مشترک ہیں۔ کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرنے کی بجائے ہم اس پر زور دیں کہ اصل و بنیاد کے اعتبار سے ہم سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ ہم سب ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔

ان اندرونی خرابیوں کے بعد صدر مملکت نے اس بیرونی خطرہ کا ذکر کیا جو اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ انھوں نے کہا

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ان کی باہم کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مذہب کمیونزم کا کوئی مؤثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کشمکش میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے جو روح انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔"

اس خطرہ کی روک تھام کے سلسلہ میں انھوں نے فرمایا۔

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر، عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک متمدنی، سیاسی، معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔ (طلوع اسلام، جون ۱۹۵۹ء)

ان تصریحات کو آپ دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں اسلام کی کس قدر صحیح تصویر سامنے لائی گئی ہے۔ یہی ہیں محترم صدر مملکت کے وہ خیالات جنھیں ہم ۱۹۵۹ء کے عسکری انقلاب کا سب سے بڑا عطیہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ خیالات ایک زندہ پیکر اسی صورت میں اختیار کر سکتے ہیں جب مملکت کا آئین ان خطوط پر مرتب ہو۔ صدر مملکت کی ایک حالیہ تقریر کے مطابق، ایک دو ماہ کے اندر اندر آئینی کمیشن کا تقرر عمل میں آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ آئین کے ممکن العمل، کامیاب اور اسلامی ہونے کا دار و مدار اس پر ہوگا کہ آئینی سفارشات تجویز کرنے کا اہم فریضہ جن حضرات کے سپرد کیا جائے گا ان کے خیالات کس قسم کے ہیں۔ صدر مملکت کے جو خیالات گذشتہ صفحات میں سامنے آچکے ہیں، ان کی روشنی میں توقع کی جا سکتی ہے کہ آئین کمیشن کی ترتیب کے سلسلہ میں یہ بنیادی حقیقت یقیناً ان کے پیش نظر ہوگی کہ یہ کمیشن ان ارکان پر مشتمل ہونا چاہیئے۔

(۱) جو اسلامک آئیڈیالوجی ـــــ قرآن کریم کے ابدی حقائق اور مستقل اقدار کی صداقت پر یقین محکم رکھتے ہوں۔

(۲) جو قرآن کریم کو نوعِ انسانی کے لئے واحد، مکمل اور آخری ضابطۂ حیات سمجھتے ہوں اور اسی کی بنیادوں پر پاکستان کے لئے آئین مرتب کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہوں۔

(۳) جو اپنے اندر اتنی جرأت رکھتے ہوں کہ جو تصور، نظریہ، عقیدہ یا نظام قرآنِ کریم کے خلاف ہو اُسے بے باکانہ مسترد کر دیں خواہ وہ مغرب کے دانشکدوں سے آئے یا اس پر ہمارے قدامت پرست طبقہ کی مہرِ تقدیس ثبت ہو۔

(۴) سنہ ۱۹۵۶ء کے دستورِ پاکستان کی تدوین، تنفیذ اور اس کے "اسلامی" قرار دینے میں جن کا کوئی حصہ نہ ہو (اس لئے کہ جو لوگ اُس آئین کو مملکتِ پاکستان کے لئے بہترین اور صحیح اسلامی آئین تصور کرتے تھے، وہ صحیح آئین مرتب کر ہی نہیں سکتے) اور

(۵) پاکستان کے بنیادی تصور اور مملکتِ پاکستان کے ساتھ جن کی وفاشعاری ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بلند ہو۔

ہمیں امید ہے کہ اگر آئینی کمیشن اس قسم کے ارکان پر مشتمل ہو گیا تو پاکستان کو ایک ایسا آئین مل جائے گا جو نہ صرف ملتِ پاکستانیہ کو کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف لے جائے بلکہ نوعِ انسان جن مشکلات میں مبتلا ہے، ان کے حل کے لئے بھی دلیلِ راہ بن جائے۔ ایسا ہو جائے تو پھر ہم انتہائی فخر و مسرت کے ساتھ "آسمان" سے کہہ سکیں گے کہ

دیدۂ آغازم، انجامم نگر

اس وقت ہمارا عسکری انقلاب فی الحقیقت نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت بن جائے گا۔ اور ہماری تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گا۔ وذالک علی اللہ یسیر۔

بخطاب جنرل محمد ایوب خان صدرِ مملکتِ پاکستان

بیا تا کارِ این اُمت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چنان نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلا گدازیم

اقبالؒ

نظامِ پاکستان کے متعلق علامہ اقبالؒ کا خط

قائدِ اعظم مرحوم کے نام

پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کا دیا ہوا ہے حصولِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے اس کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ اُس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظمؒ کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے۔ اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہو گئی تو اس کا نظام کن خطوط پر تشکیل ہونا چاہیئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اسکی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی عوام کیلئے کبھی جاذب نگاہ نہیں بن سکتی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید کے آئین کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائینگی۔ عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا لیکن ملازمتوں کی بابت ہی نہیں، دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے..... اسلئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس بارہ میں کچھ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (DEVELOPMENT) دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے ہر فرد کو کم از کم سامانِ پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے۔ (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔"

مصر کے شہرہ آفاق ادیب، مفکر اور مورخ

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی عظیم تصنیف

الفتنۃ الکبریٰ

(جسے ادارہ طلوع اسلام نے اردو میں شائع کیا)

کے متعلق

بعض مؤقر جرائد کی رائے

● پوری کتاب بڑی دلچسپ اور بڑی عبرت آموز ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ مصنف نے انتہائی نازک موضوع پر قلم اٹھایا ہے مگر توازن کا دامن کہیں بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ کوئی شخص ان پر تعصب کا الزام عاید نہیں کر سکتا اور یہ اس کتاب کی بہت بڑی خوبی ہے۔ (نوائے وقت۔ لاہور)

● الفتنۃ الکبریٰ میں شہرہ آفاق مصری عالم اور مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو صدیوں سے قلوب پر اثر انداز اور تضاد مسلسل کا باعث چلا آ رہا ہے ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس تضاد سے بالاتر رہنے کے مدعی ہیں۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے انہیں اس راہ میں ان خطرناک چٹانوں سے نبرد آزما ہونا پڑا جو اس سے قبل اس موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے دوسروں کو درپیش آئیں قاری ان کے اخذ کردہ تمام نتائج سے متفق ہو یا نہ ہو بہرحال وہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے خلاف جانبداری اور جذبات پروری کے الزام کی کوئی وجہ جواز نہیں پائے گا اس لحاظ سے یہ کتاب بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کریگی اور تاریخ کے طالب علموں کے لئے قابل توجہ ثابت ہوگی۔ (سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور)

● بحیثیت مجموعی مصر کے صاحب بصیرت سکالر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ تصنیف جسے ادارہ طلوع اسلام نے محض عربی مصنفین کے انداز تحریر و استدلال سمجھانے کے لئے شائع کیا ہے بیش قیمت معلومات کا ایک لائق مطالعہ مرقع ہے جو دینی امور پر منطق و سیاست کے انداز سے فکر کرنے والے حلقوں میں خوب مقبول ہوگا۔ (ہفتہ وار "لاہور")

قیمت:- چھ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوع اسلام، ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ ـــ لاہور

آپ کے فائدے کی بات

(ایک اہم اعلان)

● لاہور میں رہنے والے، یا باہر سے آنے والے احباب کو اب طلوعِ اسلام کا لٹریچر لینے کے لئے گلبرگ نہیں آنا پڑے گا۔ انکی سہولت کی خاطر ہم نے شہر میں

مکتبہ طلوعِ اسلام

قائم کر دیا ہے۔ جہاں سے نہ صرف طلوعِ اسلام کی کتابیں اور رسالہ مل سکیگا بلکہ اور ہر قسم کی کتابیں بھی۔

● باہر سے بذریعہ ڈاک کتابیں منگانے والے حضرات کو اب ہر ایک کتاب کے لئے الگ الگ دکانداروں کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ لاہور سے جو کتاب بھی منگانا چاہیں، ایک کارڈ

مکتبہ طلوعِ اسلام

کے نام لکھدیں۔ کتاب بذریعہ ڈاک اُن تک پہونچ جائے گی۔

● مکتبہ کا جائے وقوع۔ سرکلر روڈ سے شاہ عالمی مارکیٹ کی بڑی سڑک پر جایئے۔ کوئی سو قدم کے فاصلے پر (بہاولپور بنک سے ذرا آگے) دائیں ہاتھ پہلی سڑک پر مکتبہ کا بورڈ نظر آجائے گا۔

● ادارہ طلوعِ اسلام بدستور ۲۵۔ بی گلبرگ میں رہے گا۔ رسالہ طلوعِ اسلام کی خریداری سے متعلق تمام خط و کتابت ادارہ سے کی جائے۔ البتہ دوسرے لٹریچر کے لئے مکتبہ کو لکھیئے۔

مکتبہ کے لئے ڈاک کا پتہ } ناظم مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور ۱

جشنِ عیدمیلادالنبیؐ کی تقریب

پر

ادارۂ طلوعِ اسلام لاہور — کا

گراں بہا تحفہ

معراجِ انسانیت

(سیرتِ نبی اکرم قرآن کریم کے آئینہ میں)

۲۰ بیس روپے

کی بجائے

۱۵ پندرہ روپے

قرآنِ کریم کے خلاف بہت بڑی سازش

دین کا مدار یقین پر ہے۔ یقین اس بات پر کہ (۱) قرآن کریم خدا کی طرف سے تمام نوعِ انسان کے لئے آخری، مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے اور (۲) جو قرآن کریم اس وقت امت کے پاس ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ ان میں سے اگر کسی بات میں ذرا سا بھی شک پیدا ہو جائے تو دین کی ساری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو دین سے دور ہٹانے کے لئے جو سازشیں ہوئیں ان میں سب سے گہری اور خطرناک سازش یہ تھی کہ ان کے دل میں قرآن کی طرف سے شکوک پیدا کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس خیال کو عام کیا گیا کہ نبی اکرمؐ قرآن کریم کو مرتب اور محفوظ کتابی شکل میں امت کو دے کر نہیں گئے تھے بعد میں صحابہ نے اس کی جمع و تدوین کی کوشش کی۔ ہڈیوں، پتھروں، پتوں اور کھالوں پر لکھی ہوئی منتشر آیات کو یکجا کیا گیا۔ اور اس طرح ایک صحیفہ مرتب کر کے اسے قرآنِ کریم کا اوّلین نسخہ قرار دیا گیا۔ اس ضمن میں کتب روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس نسخہ کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں بڑے بڑے صحابہ کرامؓ میں آپس میں اختلافات ہی نہیں بلکہ تنازعات پیدا ہوئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے (بقول ان روایات کے) یہ بھی کہدیا کہ فلاں فلاں آیت جس کی ہم رسول اللہ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے، اس نسخہ میں موجود نہیں۔ اور جب ان آیات کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت ان آیات کو حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ طلوعِ اسلام نے قطعی دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ یہ تمام روایات وضعی ہیں۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو خود جمع اور مرتب فرمایا تھا اور اسے مکمل کتابی شکل میں امت کو دے کر گئے تھے[1]۔ ان دلائل کا رد کسی کے پاس نہیں تھا لیکن قرآنِ کریم کو مشکوک بنانے والی ذہنیتیں خاموش تھوڑا بیٹھ سکتی ہیں؟ انھوں نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالا اور کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ وحی کی کتابت خود نبی اکرمؐ نے کرائی تھی لیکن

> یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلعم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا۔ اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی۔ اس کے

---

[1] یہ مضامین "مقامِ حدیث" میں شامل کر دیئے گئے تھے۔

اندرونِ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے۔ کیونکہ اُس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔

اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی۔

کٮاٮ احکمٮ اٮٮه ٮم ڡصلٮ مں لدں حکٮم حٮٮر

اس "تاریخی حقیقت" کا انکشاف سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے اُس مضمون میں فرمایا ہے جو ترجمان القرآن بابت جون ۵۹ء میں "ایک سائل کے سوال کے جواب میں شائع ہوا ہے۔ اوپر کا اقتباس اُس رسالہ کے صفحہ ۱۷۳ سے لیا گیا ہے۔ اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے۔ اور بہر حال با معنی بنا کر پڑھا کرتے تھے لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آ جاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رُو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہلِ زبان کو بھی بکثرت التباسات پیش آ جاتے اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ لکھنے والے کا منشا کیا ہے۔ (ص ۱۷۳)

یورپ کے متعصب پادریوں اور بھارت کے تنگ نظر آریہ پنڈتوں نے قرآن کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے ان میں سے کسی نے بھی قرآن کے خلاف وہ الزام نہیں لگایا جو مودودی صاحب عائد فرما رہے ہیں۔ عربی رسم الخط کی تاریخ اور زمانہ نزولِ قرآن میں اس کی صحیح ہیئت اور پوزیشن، ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق ضمناً کچھ لکھنا مفید نہیں ہوگا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس فنی موضوع کے متعلق مستند معلومات قارئین کے سامنے پیش کریں۔ لیکن اتنا تو تاریخ کا عام طالب العلم بھی جانتا ہے کہ

تبابعہ کے دور میں (یعنی نزولِ قرآن سے بہت پہلے) جب حضرت و شہریت کا چرچا ہوا۔ شہروں کی آبادی بڑھی۔ تو خطِ عربی جس کو خطِ حمیری کہتے ہیں، معراجِ ترقی پر پہنچا۔ جب تبابعہ نے بساطِ دنیا کو چھوڑا تو آلِ منذر یعنی سلاطینِ حیرہ کے ہاں فنِ کتابت کا رواج پڑا...... پھر حیرہ کی شاگردی اہلِ طائف اور قریش نے کی۔ (مقدمہ ابنِ خلدون۔ تیسویں فصل۔ دربارہ کتابت)

ظاہر ہے کہ جس رسم الخط میں اتنی بڑی سلطنت کا کاروبار چلتا تھا اور جسے سلاطینِ حیرہ رواج دیتے تھے، وہ اس قسم کا نہیں ہو سکتا جسے "اہلِ زبان اٹکل سے پڑھیں اور انھیں اس میں بکثرت التباسات پیش آ جائیں"۔ "بکثرت التباسات" تو ایک طرف کسی سلطنت کے ایک زمان میں بھی کوئی التباس واقع ہو جائے تو معاملہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے!

بہر حال، مودودی صاحب نے قرآنی رسم الخط کے متعلق یہ کچھ لکھ کر، کم از کم اپنے جاہل عقیدتمندوں کے دل میں اتنا شک تو ضرور پیدا کر دیا کہ اگر قرآن رسول اللہؐ کے زمانہ میں لکھا بھی گیا تھا تو بھی وہ ایسا تھا جس میں "بکثرت التباسات" پیدا ہو سکتے تھے۔ یہی ان کا مقصد تھا۔

اس کے بعد مودودی صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن کریم کا مدار صرف کتابت پر ہی نہیں تھا۔ اسے لاکھوں

مسلمانوں نے زبانی یاد کر رکھا تھا، اس لئے اس میں اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا انہوں نے اس محاذ کو بھی سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

> اب وہ کیا چیز ہے جس کی بدولت آج دنیا میں ہم قرآن کا ایک ہی متفق علیہ متن پا رہے ہیں ...... یہ اسی نعمت کا صدقہ ہے جس کی قدر گھٹانے اور جس پر سے اعتماد اٹھانے کے لئے منکرین حدیث ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ یعنی روایت۔ (ایضاً ص۱۷۱)

اس کی تفصیل میں وہ فرماتے ہیں۔

> تیسری اہم ترین تاریخی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی اشاعت ابتداءً تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی تلقین کی صورت میں ہوئی تھی۔ نبیؐ نے قرآن کی عبارت کو کاتبانِ وحی سے لکھوا کر محفوظ تو ضرور کرا دیا تھا لیکن عوام میں اس کے پھیلنے کا اصل ذریعہ یہ تھا کہ لوگ براہ راست حضورؐ کی زبان سے قرآن کو سن کر یاد کرتے تھے اور حضورؐ سے سیکھنے والے آگے دوسروں کو سکھاتے اور حفظ کراتے تھے۔ اس طرح قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب جو عین تنزیل کے مطابق تھا ہزارہا آدمیوں کو حضورؐ سے معلوم ہوا اور پھر لاکھوں آدمیوں کو حضورؐ کے شاگردوں کی زبانی تعلیم سے حاصل ہوا۔ (ص۱۷۱)

آپ کو یقیناً اس خیال سے اطمینان ہوا ہو گا کہ (مودودی صاحب کے پہلے قول کے مطابق) کتابت میں جو بہت بڑا نقص تھا اسے زبانی حفظ نے دور کر دیا اور اس طرح قرآن کریم میں لفظی اختلاف کا تصور باطل قرار پایا۔ لیکن اگر یہی خیال پیدا کرنا ہوتا تو مودودی صاحب اس قدر زحمت کیوں فرماتے؟ ان کے پیش نظر مقصد تو قرآن کے متعلق دلوں میں شک پیدا کرنا ہے۔ اس لئے سنئے کہ وہ آگے بڑھ کر کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

> ان عام معلمین قرآن کے علاوہ تابعین و تبع تابعین کے عہد میں ایک گروہ ایسے بزرگوں کا بھی پیدا ہو گیا جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ قرأت قرآن میں اختصاص پیدا کیا۔ یہ لوگ ایک ایک لفظ کے تلفظ، طریق ادا[1] اور اعراب کو معلوم کرنے کے لئے سفر کر کے ایسے اساتذہ کے پاس پہنچے جو رسول اللہؐ سے قریب تر نسبتِ تلمذ رکھتے تھے اور ہر ہر لفظ کی قرأت کے متعلق یہ نوٹ کیا کہ اسے انہوں نے کس سے سیکھا ہے اور اس کے استاد نے کس سے سیکھا تھا؟ (ص۱۷۶)

---

[1] اس مقام پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس اختلافِ قرأت کے متعلق یہاں گفتگو ہو رہی ہے۔ اس سے تلفظ اور طریق ادا مراد نہیں۔ اس سے الفاظ اور آیات کا اختلاف مراد ہے۔ چونکہ عربی زبان میں اعراب کے اختلاف سے معنوں میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے اختلافِ قرأت میں اختلاف اعراب بھی شامل ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اختلاف قرأت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سامنے رکھنا چاہیئے۔ مودودی صاحب "تلفظ اور طریق ادا" لکھ کر خواہ مخواہ الجھاؤ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ حضرات تابعین و تبع تابعین (رح) کی یہ کوششیں بھی بڑی مسعود و مبارک تھیں کہ انھوں نے قرآن کی صحیح قرأت کے لئے اتنی اتنی تکلیفیں گوارا فرمائیں۔ لیکن دیکھئے کہ مودودی صاحب ان کی ان کوششوں کا نتیجہ کیا بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اسی مرحلہ میں یہ بات تحقیق ہوئی کہ مختلف صحابیؓ اور ان کے شاگردوں کی قرأت میں کہاں کہاں کیا کیا اختلافات ہیں۔ ان میں سے کون سے اختلافات شاذ ہیں۔ کون سے مشہور ہیں۔ کون سے متواتر ہیں۔ اور ہر ایک کی سند کیا ہے؟ (ص ۱۷۶)

یعنی ابھی ابھی آپ نے مودودی صاحب کو یہ کہتے سنا تھا کہ صحابہؓ قرآن کو براہِ راست حضورؐ کی زبانِ اقدس سے سن کر یاد کرتے تھے

اس طرح قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب جو عین تنزیل کے مطابق تھا ہزارہا آدمیوں کو حضورؐ سے معلوم ہوا۔ اور پھر لاکھوں آدمیوں کو حضورؐ کے شاگردوں کی زبانی تعلیم سے حاصل ہوا۔ (ص ۱۷۵)

لیکن اس کے بعد

یہ بات تحقیق ہوئی کہ مختلف صحابیؓ اور ان کے شاگردوں کی قرأت میں اختلافات ہیں۔ اور ان میں کئی اختلافات متواتر چلے آرہے ہیں۔

لیجئے! کتابت کے سقم کی وجہ سے پیدا ہونے والے اختلافات سے بچنے کے لئے زبانی تعلیم کا طریق اختیار کیا گیا لیکن (مودودی صاحب کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ) یہ طریق بھی ناکام رہا۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ خود صحابہؓ کی قرأت میں جنھوں نے قرآن کو براہِ راست حضورؐ کی زبان سے سنا تھا ابھی اختلافات موجود تھے۔ واضح رہے کہ "قرأت کے اختلاف" سے مراد لب و لہجہ کا اختلاف نہیں۔ الفاظ کا اختلاف الفاظ کے اعراب کا اختلاف۔ اور آیتوں کی آیتوں کا اختلاف ہے۔ روایات یہ بتاتی ہیں کہ مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے مختلف نسخے تھے اور ایک کا نسخہ دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ ان اختلافات کی کثرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک حضرت ابن مسعودؓ کے نسخہ میں حضرت عثمانؓ کے مصحف سے قریب ڈیڑھ سو اختلافات تھے۔ الفاظ کا اختلاف۔ اعراب کا اختلاف۔ آیات کا اختلاف (ان تمام امور کی تفاصیل ادارہ سے شائع شدہ کتاب "مقامِ حدیث" میں ملے گی)

اس کے بعد مودودی صاحب نے ان سات اصحاب کا ذکر کیا ہے جو مختلف قرأتوں کے امام تصور کئے جاتے ہیں اور جن کا کمالِ علم تمام امت میں تسلیم کیا گیا ہے۔" (ص ۱۷۷) اور

(جن) کی ہر قرأت کے بکثرت گواہ دنیائے اسلام کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان اماموں کی قرأتیں امت میں مسلّم مانی گئیں۔ (ص ۱۷۹)

آپ یقیناً محو حیرت ہوں گے کہ جب ہزارہا صحابہؓ نے خود نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے قرآن یاد کیا۔ اور ان کے لاکھوں شاگردوں نے اُن سے قرآن حفظ کیا تو پھر قرأتوں میں اس قدر اختلافات کیسے پیدا ہو گئے؟ اور وہ بھی اس انداز سے کہ "ہر قرأت کے بکثرت گواہ دنیائے اسلام کے ہر حصے میں پائے جاتے تھے۔" اور ان مختلف قرأتوں کو امت نے مسلّم مان لیا! سنئے کہ اس کا جواب مودودی صاحب کے ہاں

سے کیا ملتا ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ یہ قرأتیں یونہی صحیح تسلیم نہیں کرلی جاتیں۔

ہر قرأت کے لئے اس امر کا ثبوت لازماً ہونا چاہیئے کہ اس لفظ یا اس عبارت کو حضورؐ نے اس طرح پڑھا تھا یا کسی صحابیؓ کو اس طرح پڑھایا تھا۔ (ص ۱۷۹)

لیجئے! تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے! قرأتوں کا اختلاف تابعین یا تبع تابعین کے زمانے کا پیدا شدہ نہیں۔ خود حضورؐ نے قرآن کو مختلف الفاظ اور عبارتوں کے ساتھ پڑھا تھا اور اس طرح صحابہؓ کو پڑھایا تھا۔ ذرا تفصیل سے سنئے۔ فرماتے ہیں۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ معتبر قاریوں کے واسطے سے متواتر اور مشہور سندوں کے ساتھ جو مختلف قرأتیں ہم تک پہنچی ہیں ان کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے؟ کیا حضورؐ نے خود ہی بعض الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھا اور پڑھایا تھا یا ان میں سے کسی قرأت کو حضورؐ کی طرف غلط نسبت دیدی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فی الواقع حضورؐ نے ہی بعض الفاظ مختلف طریقوں سے پڑھے اور پڑھائے ہیں۔ (ص ۱۸۰)

تابعینؒ سے بات صحابہؓ تک پہنچی تھی اور صحابہؓ سے خود رسول اللہؐ تک۔ اب آگے سنئے۔ (ایک مثال دیکر) فرماتے ہیں۔

سند سے قطع نظر عقل بھی کہتی ہے کہ جبریل نے دونوں قرأتوں کے ساتھ یہ لفظ حضورؐ کو سکھایا ہوگا اور حضورؐ اس لفظ کو کبھی ایک طرح اور کبھی دوسری طرح پڑھتے ہوں گے۔ (ص ۱۸۰)

لیجئے۔ اب خود اللہ میاں بھی اس میں شامل ہوگئے۔ کیونکہ جبریل تو حضورؐ کو وہی پڑھاتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی تھی۔

(یہ ہے وہ) نعمت جس کی بدولت قرأتوں کے وہ بے شمار ممکن اختلافات جن کی گنجائش مصحفِ عثمانی کے رسم الخط اور زبان و محاورہ میں نکل سکتی تھی، گھٹ کر چند مستند اختلافات تک محدود رہ گئے اور ہم کو یہ سعادت میسر ہوئی کہ قرآن جیسا نبی اکرمؐ نے پڑھا یا پڑھایا تھا ویسا ہی آج ہم بھی پڑھ سکیں۔ (ص ۱۸۰)

اس سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کی تحقیق کی رُو سے قرآن کریم میں اختلافات ہیں (چند ہی سہی) اور وہ مستند ہیں۔ ان "اختلافات" کی تحقیق سے فائدہ یہ ہوا کہ "ہم کو یہ سعادت میسر ہوئی کہ قرآن جیسا نبی اکرمؐ نے پڑھا یا پڑھایا تھا ویسا ہی آج ہم پڑھ سکیں"۔

لیکن ابھی ابھی مودودی صاحب یہ فرما رہے تھے کہ

اب وہ کیا چیز ہے جس کی بدولت آج دنیا بھر میں ہم قرآن کا ایک ہی متفق علیہ متن پا رہے ہیں۔ (ص ۱۷۵)

سوال یہ ہے کہ

(۱) رسول اللہؐ نے جس طریق پر جبریل سے قرآن سیکھا اور صحابہؓ کو سکھایا تھا، اس میں الفاظ اور آیات ایک ہی طریق سے نہیں بلکہ مختلف طریق سے آئے تھے۔

(ii) لیکن قرآن کا جو متن ہمارے پاس ہے (اور جسے مودودی صاحب متفق علیہ قرار دے رہے ہیں) اس میں وہ اختلافات نہیں ہیں اس میں ہر لفظ اور ہر آیت ایک ہی طریق پر لکھی ہے۔ تو

(iii) یہ کس طرح کہا جائے گا کہ ہم قرآن کو اُسی طرح سے پڑھتے ہیں جس طرح رسول اللہ نے پڑھایا پڑھایا تھا؟ اور پھر یہ کہ

(iv) وہ قرآن کہاں ہے جس میں وہ اختلافی قرأتیں موجود ہیں جنھیں رسول اللہ نے پڑھایا پڑھایا تھا؟ وہ کون تھا جس نے قرآن سے ان (مستند) اختلافی قرأتوں کو نکال کر صرف ایک ہی متن باقی رکھا؟ اس کے اس فعل کو کیا کہا جائے گا؟

خود مودودی صاحب نے اپنی تفسیر کے ساتھ قرآن کا جو متن شائع کیا ہے۔ اس میں وہ اختلافی قرأتیں کیوں نہیں درج کیں جن کے مطابق رسول اللہ قرآن پڑھتے اور پڑھاتے تھے؟ اس میں بھی ایک ہی متن کیوں رکھا ہے؟

ہمیں یقین ہے کہ آپ یہ پڑھ رہے ہوں گے اور آپ کا دل طلسم پیچ و تاب بن رہا ہوگا کہ بالآخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ وہی ہو رہا ہے جو کچھ مودودی صاحب کرنا چاہتے تھے! یعنی قرآن کریم کے متعلق یہ شکوک پیدا کرنا کہ جو متن ہمارے پاس ہے وہ مستند نہیں۔ مستند متن وہ ہوگا جس میں اختلافی قرأتیں موجود ہوں اور وہ قرآن دنیا میں کہیں بھی مروّج نہیں۔ لہٰذا بات صاف ہو گئی کہ مسلمان جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے اور وہ اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں تو یہ دعویٰ "تاریخی حقیقتوں" کے خلاف ہیں۔ قرآن میں اختلاف تھے۔ جبریل نے یہ اختلافات رسول اللہ کو سکھائے۔ رسول اللہ نے انھیں صحابہؓ کو پڑھایا۔ لیکن اس کے بعد کسی نے اُس (اختلافات والے قرآن) کو کہیں غائب کر دیا اور موجودہ قرآن رائج کر دیا۔ حالانکہ ان اختلافات میں اللہ تعالیٰ نے بڑی مصلحتیں اور حکمتیں رکھی تھیں۔ چنانچہ (ان اختلافات کی مثال پیش کرتے ہوئے) مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

> ایک اور مثال آیتِ وضو کی ہے جس میں اَرْجُلَكُمْ کی دو متواتر قرأتیں منقول ہوئی ہیں۔ نافع عبداللہ بن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قرأت اَرْجُلَكُمْ (ل کے زبر کے ساتھ ہے جس سے پاؤں دھونے کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ اور عبداللہ بن کثیر، حمزہ بن حبیب، ابوعمرو بن العلاء، اور عاصم کی قرأت اَرْجُلِكُمْ (ل کے زیر کے ساتھ ہے جس سے پاؤں پر مسح کرنے کا حکم نکلتا ہے[1]۔ بظاہر ایک شخص محسوس کرے گا کہ یہ دونوں قرأتیں متضاد ہیں۔ لیکن نبی اکرمؐ کے عمل سے معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل ان میں تضاد نہیں ہے بلکہ دو مختلف حالتوں کے لئے دو الگ الگ احکام کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بے وضو آدمی کو وضو کرنا ہو تو اسے پاؤں دھونا چاہیئے۔ باوضو اگر تجدید وضو کرے تو وہ صرف مسح پر اکتفا کر سکتا ہے۔ وضو کر کے اگر آدمی پاؤں دھونے کے بعد موزے پہن چکا ہو تو پھر بحالتِ قیام ایک شب و روز تک اور بحالتِ سفر تین شب و روز تک وہ صرف

---

[1] لیجئے! سنی اور شیعہ دونوں راضی ہو گئے۔

موزوں پر مسح کر سکتا ہے۔ حکم کی یہ وسعت ان دو قراتوں کی بدولت ہی واضح ہوتی ہے۔ (ص ۱۸۱-۱۸۰)

آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اَرْجُلِکُمْ اور اَرْجُلِکُمْ دونوں قراتیں نازل کر کے اپنی کس حکمتِ بالغہ کا ثبوت دیا تھا لیکن مسلمانوں نے اپنے قرآن میں صرف ایک قرات (اَرْجُلِکُمْ) باقی رکھ کر اور دوسری قرات کو قرآن سے خارج کر کے کس طرح اپنے آپ کو ان نعمتوں سے محروم کر لیا؟ ہم مودودی صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ براہِ کرم اپنی تحقیق اپنی کایہ گوشہ بھی سامنے لائیں کہ

(۱) وہ کون تھا جس نے قرآن میں اتنا بڑا تصرف کیا کہ اللہ کی نازل کردہ متعدد قراتوں کو قرآن سے نکال کر صرف ایک قرات کو باقی رہنے دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے اس دعویٰ کو (معاذ اللہ) رد کر کے دکھا دیا کہ "ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔" اور

(۲) کس طرح ہوا کہ امت نے اس شخص کی جرات و بے باکی کو اس طرح قبول کر لیا کہ اسی کے تن قرآن کو حقیقی قرآن سمجھ کر اسے اپنے ہاں رائج کر لیا۔ اور اسے برابر رائج کئے جا رہی ہے۔

ان کی یہ تحقیق امتِ مرحومہ کے لئے موجبِ ہزار تشکر ہو گی کیونکہ اس سے امت کے پاس وہ مکمل قرآن بھی آ جائے گا جس میں خدا کی اس قسم حکمتیں پوشیدہ تھیں اور آئندہ کے لئے امت اس قسم کے لوگوں سے محتاط بھی رہے گی!

آپ نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ مودودی صاحب نے آیتِ وضو کی دو قراتوں کے رموز و مصالح کس حتم و یقین سے بیان فرمائے ہیں یعنی ایک قرات جس میں پاؤں دھونے کا حکم ہے اور دوسری قرات جس میں پاؤں پر مسح کرنے کا حکم ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ وہ اسی آیت کے سلسلہ میں اپنے رسالہ ترجمان القرآن بابت فروری ۵۹ء میں کیا فرما چکے ہیں[1] تحریر ہے۔

ہمیں نظر آتا ہے کہ صحابہؓ کی اتنی کثیر تعداد رسول اللہ سے پاؤں دھونے کے قول اور عمل کو نقل کرتی ہے اور تابعین کی اس سے بھی زیادہ تعداد صحابہؓ سے اس کو روایت کرتی ہے کہ اس خبر کی صحت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ تھوڑی سی روایات مسح کرنے کے حق میں بھی ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ رسول اللہ اور صحابہؓ کا عمل مسح کا تھا بلکہ دو تین صحابیوں کی اپنی رائے تھی کہ قرآن صرف مسح کا حکم دیتا ہے..... اس سے ظاہر ہے کہ روایات کا وزن تمام تر غسل قدمین کے حق میں ہے اور مسح کی تائید بہت ہی کم سنداً و معنیً کمزور روایتیں کرتی ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

اب عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشا سے قریب تر

---

[1] یہ بحث طلوع اسلام بابت اپریل ۵۹ء میں "قرآن کی حقیقت" کے عنوان سے گذر چکی ہے۔

محسوس ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیتِ وضو میں اَرْجُلَکُمْ اور اَرْجُلِکُمْ (دونوں) قراتیں نازل کیں ـــــ یعنی اس نے پاؤں دھونے اور مسح کرنے کے احکام برابر دیئے ـــــ تو رسول اللہ نے صرف اول الذکر حکم پر ہی کیوں عمل فرمایا۔ یہ کیوں نہ کیا کہ کبھی پاؤں دھولئے اور کبھی مسح کرلیا۔ نیز مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ "مسح کرنا" دو تین صحابیوں کی اپنی رائے تھی، کس قدر خلافِ حقیقت قرار پائیگا۔ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب "عقل" کے لحاظ سے بھی پاؤں دھونے کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشا سے قریب تر ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا حکم (یعنی مسح کرنا) عقل کے خلاف تھا؟ اگر کہا جائے کہ مسح کا حکم خاص حالات کے ساتھ مشروط تھا تو سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) اتنی سی بات بھی صاف طور پر کہنی نہیں آتی تھی جو اسے اَرْجُلَکُمْ اور اَرْجُلِکُمْ کے رموز و اشارات میں بیان کیا۔ اور پھر قرآن میں صرف اَرْجُلَکُمْ ہی رہ گیا!

مودودی صاحب کے ان فقرات کو پھر سامنے لایئے جن میں انھوں نے کہا ہے کہ

> اب وہ کیا چیز ہے جس کی بدولت آج دنیا میں ہم قرآن کا ایک ہی متفق علیہ متن پا رہے ہیں۔ اور جس کی بدولت قراتوں کے اختلافات امکانی وسعتوں تک پھیلنے کے بجائے صرف چند متواتر یا مشہور اختلافات تک محدود رہ گئے؟ یہ اُسی نعمت کا صدقہ ہے جس کی قدر گھٹانے اور جس پر سے اعتماد اٹھانے کے لئے منکرین حدیث ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ یعنی روایات۔

اس اقتباس کو ذرا غور سے دیکھئے۔ ہمارا ایمان ہے کہ

(۱) جو قرآن خدا نے رسول اللہ پر نازل کیا وہی قرآن حضورؐ نے مرتب شکل میں اُمت کو دیا۔ اور وہی قرآن حرفاً حرفاً اپنی محفوظ اور مکمل شکل میں اِس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ یہی امت کا متفق علیہ متن ہے۔

(۲) جو روایات یہ بتاتی ہیں کہ قرآن کے بعض الفاظ اور آیات مختلف شکلوں میں نازل ہوئے تھے (اسے اختلافِ قرأت کہتے ہیں) وہ سب وضعی ہیں اور رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ روایات قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف ہیں اور ان سے الدین کی عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم مختلف الفاظ اور مختلف آیات کی شکل میں نازل ہوا تھا ان مختلف قراتوں میں خدا کی حکمت اور مصلحت تھی اس کی سند روایات ہیں۔

(۲) اختلافِ قرأت خدا کی نعمت ہے جو ہمیں روایات کے صدقے میں ملی ہے۔ اگر ان روایات کا انکار کر دیا جائے تو ہم اس قرآن سے محروم ہو جاتے تھے جس میں اختلافات تھے۔

ہم اربابِ بصیرت سے گذارش کریں گے کہ وہ غور کریں اور فیصلہ فرمائیں کہ اول الذکر عقیدہ قرآن کریم کے مطابق ہے یا مودودی صاحب کا پیش فرمودہ مسلک!

اس مقام پر آپ کے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ مودودی صاحب کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے بارے میں اس قسم کے خیالات پھیلا رہے ہیں؟ انھیں کچھ ہو نہیں گیا۔ وہ یہ سب کچھ ایک پروگرام کے مطابق کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کے متعلق مدت العمر کے مطالعے نے ہمیں اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ ان کے پیش نظر اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں جن کے لئے وہ دین کو آلۂ کار بناتے ہیں چنانچہ انہی مصلحتوں کے پیش نظر انھوں نے متعہ کو جائز قرار دیدیا۔ زمینداریوں کو عین مطابقِ شریعت ٹھہرایا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بڑے کام کے حصول کے لئے جھوٹ بولنا اور فریب دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ آگے بڑھے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ رسول اللہ ساری عمر سادات النسانیہ کی تبلیغ فرماتے رہے لیکن جب سلطنت حاصل ہو گئی تو (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) حکومت کو اپنے قبیلہ (قریش) کے لئے مختص کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ فتویٰ صادر فرمادیا کہ گھر کے اندر شراب کشید کرنا اور پینا کوئی جرم نہیں۔ ..... اب انھوں نے قرآن کو اپنے تیروں کا ہدف بنانا شروع کر دیا ہے اور یہ خیال پھیلانے لگے ہیں کہ موجودہ قرآن جو ہمارے پاس ہے وہ ہے ہی نہیں جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا۔ اُس قرآن میں الفاظ اور آیات مختلف طریقوں پر تھے۔

قرآن کے خلاف یہ سازش نئی نہیں۔ بہت پرانی ہے۔ اس کی ابتدا بھی خاص مصلحتوں کے ماتحت ہوئی تھی۔ اب مودودی صاحب کی طرف سے اس کا احیاء بھی خاص مصلحتوں کے ماتحت ہو رہا ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اللہ تعالیٰ اُمت کو ان فتنوں سے محفوظ رکھے۔

آئندہ صفحات میں آپ اسی موضوع پر علامہ تمنا عمادی صاحب کا مبسوط مقالہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ نقدِ روایات کے سلسلہ میں ان کا جو انداز ہے اس سے قارئینِ طلوعِ اسلام اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ مقالہ بڑے غور و فکر کا مستحق ہے چونکہ اس مقالہ کی افادیت کا تقاضا تھا کہ اسے ایک ہی اشاعت میں درج کر دیا جائے اس لئے اس ماہ دیگر عنوانات روک لئے گئے ہیں۔

لاہور۔ شاہ عالمی مارکیٹ کے اندر
مکتبہ طلوعِ اسلام
قائم کر دیا گیا ہے۔ یہاں سے طلوعِ اسلام کے لٹریچر کے علاوہ اعلیٰ معیار کی تمام کتابیں بھی آپ کو مل سکتی ہیں۔

اختلافِ قرأت

(علامہ تمنا عمادی مدظلہ۔ ڈھاکہ)

میرے دوست مولانا مودودی صاحب بھی کچھ عجیب طبیعت رکھتے ہیں۔ بن گئے ہیں ایک چھوٹی سی جماعت کے امیر۔ اور عوام ان کو بہت بڑا عالم دین سمجھتے ہیں۔ سطحی مضامین وہ بھی طول طویل لکھنے کی مشق ہے۔ بیٹھے بیٹھے کتابیں تصنیف کیا کرتے ہیں۔ اور ان کے حلقے کے لوگ ایجنٹ کی طرح ان کی کتابیں بیچا کرتے ہیں۔ مگر ان کی تحریک کا کیا مقصد ہے مجھ کو آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے بعض مضامین مجھ کو پسند بھی آئے۔ اس لئے کہ عوام کے لئے کسی قدر مفید تھے۔ مگر وہ تحقیق کے مرد میدان نہیں ہیں۔ نہ ان کی نگاہ وسیع ہے نہ ان کے پاس غور و فکر کرنے والا دماغ ہے اور نہ غور و فکر کا سلیقہ۔

کئی سال پہلے ان سے کسی نے پوچھا تھا کہ دجال کے متعلق مختلف و متضاد روایتیں ہیں۔ کسی میں ہے کہ دجال فلاں جگہ سے خروج کرے گا کسی میں کسی دوسری جگہ کا ذکر ہے۔ وغیر ذالک۔ مولانا مودودی نے اس کا جواب دیدیا کہ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اس کی خبر دی گئی تھی کہ دجال آئے گا۔ اس لئے دجال کا آنا صحیح ہے۔ اسی لئے ہر روایت میں دجال کا خروج قدر مشترک ہے۔ باقی رہا کہاں سے خروج کرے گا۔ یہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا نہیں گیا تھا۔ شروع شروع میں آپ کا خیال گیا کہ شاید فلاں جگہ سے خروج کرے تو آپ نے ایک وقت میں اپنے گمان غالب کی بنا پر اس جگہ کا ذکر فرمایا۔ کچھ دن کے بعد آپ کا خیال بدل گیا۔ اور آپ کا قیاس ایک دوسری جگہ کی طرف گیا تو اب کی بار آپ نے دوسری جگہ کا نام بتا دیا۔ اسی طرح خیال بدلتا گیا اور قیاس بھی بدلتا گیا۔ اس کے مطابق آپ نے جگہ کا نام بھی بدل بدل کر بتایا۔ اس لئے صرف مقام خروج میں اختلاف ہوتا گیا۔

میں نے اس کے متعلق اسی زمانے میں رسالہ 'البیان' امرتسر میں شائع کرا دیا تھا کہ مودودی صاحب نے یہ اچھا کیا۔ محدثین پر الزام دیتے راویانِ حدیث کے متعلق کچھ کہتے تو سارے اہل حدیث بگڑ جاتے۔ اگر میرے سے دجال کے خروج ہی سے انکار کر دیتے اور ان اختلافات کی بنا پر ان سب حدیثوں کو موضوع کہہ دیتے تو مقلد وغیر مقلد سب کے سب مل کر کفر کا فتوے صادر کر دیتے۔ اس لئے میرے دوست نے سارا

الزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھ دیا کہ امت کو اختلافات کی کشمکش میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالا نعوذ باللہ من ذٰلک۔

یہ صفت تو کفار و مشرکین کی بیان کی گئی ہے کہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون۔ یعنی یہ لوگ صرف گمان ہی کے پیچھے چلتے ہیں اور صرف اٹکل ہی لگایا کرتے ہیں۔ کوئی رسول کوئی نبی ایسا کب کر سکتا ہے۔ آپ کو تو حکم تھا لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ جب مقامِ خروج آپ کو بتایا ہی نہیں گیا تو آپ کو اس کے متعلق کوئی علم ہی نہ تھا کیونکہ آپ کے پاس علم کا ذریعہ صرف وحی تھا۔ تو جب کوئی وحی اس کے متعلق نہیں آئی۔ یہاں تک کہ القا کے ذریعے، خواب کے ذریعے بھی نہیں بتایا گیا تو آپ کیوں محض اٹکل اور قیاس سے ایک ایسی بات دینی عقیدے کے متعلق بیان کرتے جس کے متعلق آپ کے پاس معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا؟

ابھی ایک عزیز دوست نے مولانا مودودی کے ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۳ (بابت جون ۱۹۵۹ء) کے چند اوراق میرے پاس بھیج کر مجھ سے اُس سوال و جواب کے متعلق میری رائے پوچھی ہے جو ان اوراق میں درج ہیں۔ سائل کا نام سوال کے نیچے یا اوپر درج نہیں ہے۔ شاید فہرستِ مضامین کے صفحہ میں درج ہو[1]۔ مگر جواب ضرور مولانا مودودی کی طرف سے ہے۔ اگرچہ مجیب کا نام بھی مذکور نہیں ہے[2] مگر رسالہ ان کا ہے۔ ان کی ادارت میں نکلتا ہے۔ رئیس التحریر وہی ہیں۔ تو پھر جب مجیب کا نام نہیں ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہی مجیب ہیں اور اندازِ تحریر بھی شہادت دے رہا ہے۔

ماحصل سوال یہ ہے (مختصراً)

قرآن مجید میں قراتوں کا اختلاف

قرآن مجید کے متعلق ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بعینہٖ اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں حضور اکرم صلعم پر اترا تھا۔ ایک شوشے ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہے۔ دوسری طرف معتبر کتابوں میں نقطوں، اعرابوں، لفظوں اور جملوں تک کی کمی بیشی نظر آتی ہے جو روایت کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ ان روایتوں سے جو اختلاف قراءت کے نام سے مشہور ہیں۔ الفاظ ہی میں نہیں معانی میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یقیناً منزل من اللہ تو ایک ہی قراءت ہو گی باقی قرائتیں ضرور غلط ہوں گی۔ سب کو کس طرح صحیح مان لیا جائے وغیرہ ذالک۔ غرض سائل کے سوال کا یہی ماحصل ہے۔

آخر میں سائل نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "منکرین حدیث کی طرف میرا ذرہ برابر بھی میلان نہیں ہے"۔

تنقیدِ جواب

لیکن سائل کی مزید تشفی کے لئے یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ حقیر ناقد بھی منکر حدیث نبوی نہیں ہے۔ جو حدیث محدثین کے متفقہ

---

[1] سائل کا نام نہ سوال کے اوپر نیچے درج ہے نہ فہرستِ مضامین میں۔ (طلوع اسلام)

[2] فہرست مضامین میں مجیب کا نام "سید ابو الاعلیٰ مودودی" دیا ہوا ہے۔ (طلوع اسلام)

اصول کے مطابق صحیح ثابت ہو اس حدیث کو سوال مذکور کا ناقد واجب الاتباع سمجھتا ہے۔ البتہ جامعین احادیث رحمہم اللہ کی مجلدات میں جتنی حدیثیں مسطور ہیں سب کو قرآن مجید کے ساتھ مثلہ معہ نہیں مانتا۔ نہ راویوں کو جبریل سمجھتا ہے اور نہ مرویات کو آیات منزل من اللہ۔ اور میرے دین میں تقیہ و کتمان جائز نہیں ہے۔ اس لئے میں اپنا عقیدہ کبھی چھپاتا نہیں۔ اور ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار پر میرا ایمان ہے۔ اتنا گذارش کر کے تنقید شروع کرتا ہوں۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں۔

"یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید آج ٹھیک اسی صورت میں موجود ہے جس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اس میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔"

اس اعتراف کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

لیکن یہ بات بھی اس کے ساتھ قطعی صحیح ہے کہ قرآن میں قراتوں کا اختلاف تھا اور ہے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے کا باقاعدہ علمی طریقہ پر مطالعہ نہیں کیا ہے وہ محض سطحی نظر سے دیکھ کر بے تکلف فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں۔ ان میں سے لازماً کوئی ایک ہی بات صحیح ہے۔"

معلوم نہیں کہ "باقاعدہ علمی طریقہ" کون سا ہے جس کا مطالعہ کرنے سے دو متضاد چیزیں باہم متفق بلکہ متحد نظر آتی ہیں۔ وہ "باقاعدہ علمی طریقہ" تو مجھ کو معلوم نہیں۔ باقی رہی سطحی نظر یا گہری نظر تو اس کا فیصلہ میری تنقید کو دیکھ کر اہل علم و اہل دیانت و انصاف خود فرمائیں گے کہ مولانا مودودی کا جواب محض سطحی متعلدانہ غیر محققانہ ہے یا میری تنقید؟ کچھ آگے چل کر فرمایا جاتا ہے۔

حالانکہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ لوگ کچھ علم حاصل کرنے کی کوشش کریں تو خود بھی غلط فہمی سے بچ جائیں اور دوسروں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کا وبال بھی اپنے سر نہ لیں۔"

بے شک۔ اس وقت حسب الحکم علم ہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد خود فیصلہ نہیں کروں گا بلکہ ایماندار ناظرین پر فیصلہ چھوڑ دوں گا۔

ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی۔ اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے۔ کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی۔ کتب احکمت ایته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر۔ اس طرز تحریر کی عبارتوں کو اہل زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے۔ اور بہرحال بامعنی بنا کر ہی پڑھا کرتے تھے۔ لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے۔ یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رو سے ایک لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہل زبان کو بکثرت التباسات پیش آجاتے تھے۔ اور یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشا کیا ہے۔ مثلاً ایک فقرہ یوں لکھا گیا ہو کہ ربنا بعد بین اسفارنا تو اس

کو رَبَّنَا بَاعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا بھی پڑھا جاسکتا تھا اور رَبُّنَا بَعَّدَ بَیْنَ اَسْفَارِنَا بھی" (اسی طرح کی ایک دوسری مثال اور بھی دی ہے)۔ (اس کے بعد لکھتے ہیں)

یہ اختلافات تو اس رسم خط کے پڑھنے میں اہلِ زبان کے درمیان ہو سکتے تھے۔ لیکن ایک عربی تحریر اگر اسی رسم الخط میں غیر اہلِ زبان کو پڑھنی پڑجاتی، تو وہ اس میں ایسی سخت غلطیاں کرجاتے جو قائل کے منشاء کے بالکل برعکس معنی دیتی تھیں۔ (جس کی ایک مثال دی ہے) (اس کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں)

"پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ[1] تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے ابوالاسود دؤلی[2] سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں۔ اور انھوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگادیا جائے۔

اس کے بعد عبد الملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ) کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف والیٔ عراق نے دو علماء[3] کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انھوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط بعض کو غیر منقوط کرکے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگاکر فرق پیدا کیا۔ اور ابوالاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

مولانا مودودی نے "باقاعدہ علمی طریقے" پر یہ عالمانہ تحقیقی جواب دیا ہے، اور اس کے بعد ہی "ان دو تاریخی حقیقتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھنے کی فرمائش کی ہے۔ مگر مولانا کے یا مولانا ہی کی قسم کے اگلے سادہ لوح مولاناؤں کے صرف اپنی کتابوں میں لکھ دینے سے "کوئی خلافِ عقل بات" تاریخی حقیقت" نہیں بن سکتی۔ جو بات سراسر بے حقیقت ہو وہ "تاریخی حقیقت" کس طرح بن سکتی ہے؟ جو چیز آنکھوں میں کھٹکنے لگے وہ نگاہوں میں کس طرح رکھ لی جائے؟ مولانا کو اُن "تاریخی حقیقتوں" کے اپنی کتابوں میں درج کرنے والوں کو کچھ تو سوچنا تھا کہ یہ "حقیقتیں" واقعی کچھ حقیقت رکھتی بھی ہیں یا نہیں؟ کیا روایت پرستی اس طرح عقل کو اندھا کردیتی ہے کہ بدیہی سے

---

[1] ۵۳ھ ہی میں زیاد نے وفات پائی تھی۔ لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۴۹۴۔ تمنا

[2] ابوالاسود نے اپنی سمجھ اور اپنی واقفیت کے مطابق بغیر کسی معتمد علیہ جماعت کے مشورے اور استصواب کے اعراب لگادیئے۔ یہ بصرہ کے رہنے والے اور یہاں کے قاضی بھی تھے اور شیعہ تھے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۱۰ میں ان کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ انھوں نے قرآن مجید پر اعراب لگائے تھے یہ بھی لکھا ہو کہ تیقیناً میں ان کا ذکر ہے مگر استیعاب مطبوعہ حیدرآباد دکن میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ ان کا نام "ظالم" تھا جیسا کہ ابن حجر نے لکھا ہے۔

[3] وہ دو علماء کون تھے؟ کچھ معلوم نہیں۔ اتنا بڑا اہم کام جو پہلے پہل کیا جائے اور ایسے گمناموں کے سپرد کیا گیا جن کو کوئی جانتا بھی نہیں کہ کون تھے؟ اور تنہا ابوالاسود دؤلی نے بطور خود زیر، زبر اور اُدھر دو گمنام عالم نے پہلے پہل قرآن پر نقطے لگائیں۔ اپنے زمانے کے اکابر علماء اور مشاہیر ائمہ دین سے کوئی صلاح مشورہ نہ ابوالاسود نے لیا نہ ان دونوں نے لیا۔ دکھلانے کیلئے تو ان روایتوں سے بظاہر قرآن مجید کی اہمیت اور صحت ثابت کی گئی مگر باطن غور کرنیوالے کو قرآن مجید کی صحت کی طرف سے پوری طرح مشتبہ ہوجانے کا سامان کردیا۔ واقعی ان تاریخی حقیقتوں کے گھڑنے والے اپنے فن کے بڑے ماہر تھے۔ ۱۲ تمنا عمادی غفرلہٗ

ہی یہی بات بھی روایت پرستوں کو سوجھتی نہیں ہے؟ ہر صاحبِ عقل و ایمان سے میری التجا ہے کہ برائے خدا ذرا غور کیجئے۔ ب۔ ت۔ ث۔ ج۔ ح۔ خ۔ د۔ ذ۔ ر۔ ز۔ س۔ ش۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق۔ ن۔ ی۔ عربی زبان کے ۲۸ حروفِ تہجی ہیں سے یہ بائیس حروفِ تہجی ایسے ہیں جن میں امتیاز نقطوں ہی کے ہونے نہ ہونے یا اوپر نیچے ہونے یا کم و بیش ہونے کی وجہ سے ممکن ہے۔ واضع حروف نے جس دن ان حرفوں کو وضع کیا تھا اگر اسی دن، اسی وقت نقطے بھی ایجاد نہیں کئے تھے اور نقطوں ہی کے ذریعے ان میں امتیاز نہیں رکھا تھا تو اس نے یہ بائیس ہم شکل حروف وضع ہی کیوں کئے تھے؟ کیا وہ مختلف نقوش ایجاد نہیں کر سکتا تھا؟ "با" کو دیکھیے کہ اس کو با، تا، ثا، نا اور یا صرف نقطوں ہی کے فرق سے پانچ طریقے سے پڑھ سکتے ہیں۔ "حا" کو جا، حا، خا تین طریقے سے، باقی چودہ حروف کو دو دو طریقے سے۔ اگر نقطوں کا فرق واضع نے وضع کے وقت ہی نہیں رکھا تھا تو یقیناً وہ واضع ہی دیوانہ تھا۔ نقط واضع ہی نہیں بلکہ ساری قوم ہی دیوانی تھی کہ کبھی کسی نے زبان کی اس تحریری گمراہ کن خامی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور اپنی رسم خط کی اس بدترین خرابی کو دور کرنے کی ضرورت کسی شخص نے کبھی محسوس نہ کی۔ خدا جانے شعرائے جاہلیت جو اپنے قصائد سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعروں کے لکھ لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے والے ان کو کس طرح پڑھتے تھے؟ امرء القیس کا شہرہ آفاق قصیدہ جو سبعہ معلقہ کا پہلا معلقہ ہے، اس کا یہ شعر

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا ۔۔۔ بمنجرد قید الاوابد ھیکل

میں صبح کرتا ہوں ایسی ساعت میں کہ پرندے اپنے گھونسلوں میں ہوتے ہیں ۔۔۔ اپنے اونچے گھوڑے کے ساتھ جو وحشی جانوروں کو گھیر کر قید میں رکھ لیتا ہے۔

کیا کسی نے اس کو وقد اغتذی بھی پڑھا تھا؟ یعنی میں اس وقت غذا کرتا ہوں جب پرندے اپنے گھونسلوں میں ہوتے ہیں، اپنے گھوڑے کے ساتھ الخ یعنی خود بھی اسی وقت کھاتا ہوں اور اپنے گھوڑے کو بھی اسی وقت کھلاتا ہوں؟

تسلّت عمایات الرجال عن الصبا ۔۔۔ ولیس فؤادی عن ھواک بمنسل

لوگوں کے شوق و محبت کی گمراہیاں سرد پڑ گئیں ۔۔۔ اور میرا دل تیری محبت سے کنارہ کش ہونے والا نہیں

کیا اس کو کسی نے کبھی یوں بھی پڑھا تھا۔

یسلّتُ غمایات الرجال عن الصبا ۔۔۔ ولیس فوادی عن ھواک بمنسل

میں نے لوگوں کو ان کی بیہودیوں پر جو غایت شوق میں پیدا ہوئیں ملامت کی ۔۔۔ حالانکہ خود میرا دل تیری محبت سے کنارہ کشی کرنے والا نہیں ہے

تجاوزتُ اَحرَاساً علیہ ومعشرا ۔۔۔ علیّ حراصاً لو یُسِرُّونَ مقتلی

میں اس کے نگہبانوں اور اس کے لوگوں سے کترا کر نکل گیا ۔۔۔ اپنے نگہبان اور ایسے لوگ جو میری تاک میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح چھپ کر مجھ کو قتل کر دیں

کیا اس کو کسی نے یوں پڑھا تھا۔

تَجَاوَزْتُ أَحْرَاساً عَلَيْهَا وَمَعْشَراً

میں نے اسکے نگہبانوں اور اس کے لوگوں سے (دبدبہ) باتیں کیں (دلیری کا تم)

حالانکہ اس مفہوم میں اصل شعر کے مفہوم سے زیادہ بہادری کا اظہار ہے باوجود اس کے کسی نے کبھی تَجَاوَزْتُ کو تَجَاوَرْتُ نہیں پڑھا۔

لیکن کسی نے اس قسم کی روایت نہیں کی کہ معلقات سبعہ میں نقاط و اعراب نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کسی طرح پڑھتا تھا۔ کوئی کسی اور طرح۔ یہ سارے اختلافات قرأتِ قرآن ہی کے لئے تھے؟ معلقات شعرائے جاہلیت کو کبھی ان سے سابقہ نہیں پڑا۔ کیوں پڑتا؟ نہ اس وقت کوفہ تھا۔ نہ کوفے کے عجمی مفسدین ملاحدہ تھے۔ نہ کسی کو خواہ مخواہ ان میں اس طرح کے اختلافات پیدا کرنے کی اس وقت ضرورت تھی۔ قرآن مجید میں تو قصداً یہ اختلافات پیدا کئے گئے ہیں۔ اور اسی غرض سے یہ مشہور کیا گیا ہے کہ عربی رسم خط میں نقطے نہ تھے۔ سو برس کے بعد نقطے لگائے گئے اور اعراب بھی نہ تھے۔

نیز زمانہ جاہلیت کی باتیں جانے دیجئے۔ جب وحی آنا شروع ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں لکھوانا شروع کر دیں تو آپ کو تو اس کا خیال ہوتا کہ بے نقطوں کی تحریر اتنے باہم متشابہ حروف والی رسم خط میں کس طرح صحیح طور سے پڑھی جائے گی؟ کاتبینِ وحی سے آپ فرماتے کہ نقطے دے کر لکھا کرو۔ کیونکہ واضع حروف نے ضرور حروف پر نقطے لگائے تھے اور اگر واضع حروف پاگل تھا اور عہد جاہلیت کے سب لکھے پڑھے دیوانے تھے کہ ایسی گمراہ کن رسم خط کو گلے لگائے ہوئے تھے تو آپ خود نقطے لگانے کی ترکیب بتا دیتے۔ فراستِ نبویہ عبدالملک و حجاج کی عقل سے تو یقیناً کہیں بڑھی ہوئی تھی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ آپ خود لکھے پڑھے نہ تھے اس لئے حروف پر نقطے نہ ہونے سے کیا خرابی واقع ہوگی آپ کو اس کا احساس ہی نہ ہوا۔ تو کم سے کم کاتبین وحی تو متعدد تھے۔ خلفائے راشدینؓ جیسے برگزیدہ اور دور اندیش لوگ وحی لکھتے تھے، وہ لوگ یا ان میں سے کوئی تو محسوس کرتا کہ جس رسم خط میں اس قدر متشابہ حروف ہیں ان کے پڑھنے میں آئندہ لوگوں کو کس قدر دشواری ہوگی؟ اگر ان لوگوں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو بلسان عربی مبین اتارا تھا۔ اور ابانۃ (مبین ہونا) دو ہی طرح کسی قول کی ممکن ہے۔ زبانؔ سے یا قلم سے۔ مگر زبان سے ابانت پائیدار نہیں رہ سکتی۔ آواز ہوا میں غائب ہو جاتی ہے۔ کتابت ہی پائیدار ابانت کا ذریعہ ہے۔ اور عربی رسم خط کا حال اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ کو معلوم ہی تھا کہ اس میں اٹھائیس حروف ہیں جن میں بائیس حروف ایسے ہیں جنہیں ایک پاگل واضع

؎ مبین کا مفہوم اصل تو یہی ہے کہ آیاتِ قرآنی کے الفاظ اسکے جملے اسکی عبارتیں اپنے مفہوم کو واضح طور سے ظاہر کرتی ہیں۔ مگر وہ الفاظ وہ جملے اور وہ عبارتیں اسکے لئے مبین ہوتے ہیں جس کے پاس پہنچتی ہیں نہ کہ خود اپنے لئے۔ تو دوسروں تک دو ہی ذریعے سے پہنچ سکتے ہیں۔ زبان کے ذریعہ قولاً۔ یا قلم کے ذریعہ کتابۃً۔ قولاً ناپائیدار ذریعہ ہے اور کتابۃً پائیدار ذریعہ ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نازل شدہ آیات و سورۃ کی صرف زبانی تعلیم نہیں فرماتے تھے بلکہ لکھوا دیا کرتے تھے اور صحابہؓ اس کی نقلیں اپنے پاس بھی رکھ لیا کرتے تھے۔ آگے اس کی بحث کی گئی ہے۔ (تمنا)

حروف نے باہم متشابہ وضع کیا ہے اور کوئی ایسی علامت نہیں رکھی ہے جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے تمیز کیا جاسکے۔ ایسی گمراہ کن رسم خط میں جو عبارت لکھی جائے گی بذات خود وہ ہزار مبین ہو مگر پڑھنے والے کیلئے اس کی مبیئت کی نوعیت اس ہرے بھرے انواع واقسام کے پھولوں اور پھلوں والے باغ کی طرح ہوگی جو کسی ایسے پردہ ظلمات میں واقع ہو جہاں کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا ہوتا کہ تمہاری زبان کی رسم خط سخت گمراہ کن ہے۔ اس کے فلاں فلاں حروف پر اس اس طرح نقطے دلوا کر متشابہ حروف میں باہم امتیاز پیدا کرنے کے لئے اپنے کاتبوں سے کہو۔ جس چیز کی شدید ضرورت کو آغاز نزولِ قرآن کے بعد سے کم و بیش سو برس تک نہ عام صحابہ نے نہ کاتبینِ وحی نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت جبریل علیہ السلام نے نہ خود اللہ تعالیٰ نے محسوس فرمایا۔ اس کو سو برس کے بعد محسوس کیا تو اس شخص نے جو صرف اموی ہونے کی وجہ سے باوجود خلیفہ اور امیر المومنین ہونے کے بعض طبقوں میں بدنام ہے، اور اس نے بھی یہ کام اس شخص سے لیا جس پر آج تک سب و شتم کو کار ثواب سمجھا جاتا ہے بلکہ جس پر کتنے اکابر نے کفر کا فتویٰ تک دیدیا تھا۔ یعنی حجاج بن یوسف الثقفی۔ جس کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۲۔ ص ۲۱۱ میں لکھتے ہیں۔ قال[1] زاذان کان مفلسا من دینہ وقال طاؤس عجبت لمن یسمیہ مؤمنا وکفرہ جماعۃ منھم سعید بن جبیر والنخعی ومجاھد وعاصم بن ابی النجود والشعبی وغیرھم..... وقال القاسم بن مخیمرۃ کان الحجاج ینقض عری الاسلام عروۃ عروۃ۔ عبد الملک نے جو سو برس کے بعد قرآنی رسم خط کی اصلاح کا کام سپرد بھی کیا تو "ایک کافر"

---

[1] حجاج کے متعلق زاذان نے کہا کہ دینی حیثیت سے یہ شخص مفلس تھا۔ طاؤس نے کہا کہ جو اس کو مومن کہتا ہے مجھ کو اس پر تعجب ہوتا ہے اور ایک جماعت نے اس کو کافر قرار دیا تھا جن میں سعید بن جبیر نخعی، مجاہد، عاصم بن ابی النجود اور شعبی وغیرہم تھے۔ قاسم بن مخیمرہ نے کہا کہ حجاج نے تو اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوفہ اور بصرہ حضرت فاروق اعظمؓ کے وقت ہی سے مفسدوں کا مرکز تھے خصوصاً کوفہ۔ یہ موقع اسکی تفصیل کا نہیں ہے۔ بڑے ہٹ دھرم۔ بڑے شورہ پشت لوگ یہاں تھے جو تابعین و تبع تابعین کا لبادہ اوڑھے رہتے تھے۔ تنگ آکر خلیفہ وقت نے وہاں کے مفسدین کی سرکوبی کے لئے حجاج کو بھیجا۔ حجاج نے وہاں ہر شتبہ شخص کو سزائیں دینا شروع کیں کسی کو قتل کیا۔ کسی کو کوڑے مارے کسی کو قید کر دیا۔ اس لئے کوفی اور بصری دونوں اس سے خفا ہے۔ بصریوں نے اشعث کی سرکردگی میں اس پر خروج بھی کیا تھا مگر شکست کھائی۔ باغیوں میں قاریوں کی خاص جماعت تھی۔ سعید بن جبیر بھی انہی باغیوں میں تھے اگرچہ یہ کوفی تھے۔ اشعث کی شکست کے آثار دیکھ کر بھاگ نکلے اور مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ وہاں چھپے رہے۔ کچھ مدت کے بعد وہاں کے والی خالد بن عبد اللہ القسری نے ان کو پالیا اور گرفتار کرکے حجاج کے پاس بھیجدیا۔ حجاج نے پوچھا تمہیں بغاوت پر کس چیز نے آمادہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں بیعت کر چکا تھا (یعنی اشعث کے ہاتھ پر) حجاج نے کہا کہ امیر المومنین کی بیعت وفاداری کی زیادہ مستحق تھی یا باغیوں کی جمعیت؟ اس کے بعد قتل کا حکم دیا۔ غرض کوفیوں ہی نے بصرے میں بغاوت کی سازش کی تھی اور بصرے والوں کو خروج پر آمادہ کیا تھا۔ اس لئے سعید بن جبیر جو بنی اسد کے غلام آزاد کردہ تھے اور متعدد کوفی بصریوں کے ساتھ اس بغاوت میں شریک ہوئے کوفہ میں بنی اسد کا ایک محلہ تھا جس میں سو فیصدی شیعہ تھے۔ اور زاذان ابو عبد اللہ کندیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفی تھے۔ طاؤس بحیر بن ریسان کے غلام تھے جو یمانیوں کی غلامی میں آکے آزاد ہو گئے۔ آزادی سے قبل کوفے میں تھے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کو اسلام کی اتنی بڑی خدمت اس کے ہاتھ سے انجام پائی جس نے بقول قاسم بن مخیمرہ اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں ۔

رہ گئے سب یوں ہیں شیخ و حرم — کام کا ایک رند ہی نکلا

ایک تعجب خیز تاریخی حقیقت

مولانا مودودی نے "دو تاریخی حقیقتیں" بیان فرمائی ہیں ایک کا تعلق اعراب یعنی زبر زیر پیش کی ایجاد سے ہے اور دوسری "حقیقت" کا تعلق نقطوں کے "پہلے پہل" اختراع سے۔ مولانا مودودی کے بیان کے مطابق پہلے زیاد کو اعراب کی ضرورت محسوس ہوئی تھی ۵۳ھ سے ۶۰ھ تک کے درمیان اس آٹھ سال کے اندر زیاد بن ابیہ نے ابو الاسود دؤلی سے قرآن مجید کے حروف پر اعراب لگوائے۔ مگر اس وقت بھی نہ زیاد کو نقطوں کے لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ ابو الاسود کو۔ حالانکہ ہر موٹی سے موٹی عقل والا بھی اس کو سمجھ سکتا ہے کہ ایسی متشابہ حروف والی رسم الخط کے لئے اعراب سے زیادہ نقطے ضروری ہیں۔ آپ اردو ہی رسم خط کو دیکھئے۔ بغیر زیر زبر پیش کے ہر شخص لکھتا اور پڑھتا ہے۔ کوئی بھی کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ لیکن ایک پورا صفحہ بغیر نقطوں کے لکھ جائیے تو پڑھنے والے کو ضرور دشواری محسوس ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے کہ مولانا مودودی ہی کی عبارت سے نقطے حذف کر کے لکھئے تو ان کی "تاریخی حقیقتوں" کو کوئی "نارنجی حقیقتیں" پڑھ دے اور "مشرکین" "مسر کین" سمجھ لے۔ اور "بعض" کو "بغض" اور "بیٹھے" کو "پیٹھے" بنا دے تو کیا یہ ناممکن ہے؟

اس لئے مجھ کو تو یقین ہے کہ ان "تاریخی حقیقتوں" پر تاریخ و روایت کا رنگ چڑھانے والے بھی کچھ اسی قسم کا دماغ رکھنے والے تھے جیسا دماغ عربی حروف تہجی وضع کرنے والے کا تھا جس نے اٹھائیس حروف تو وضع کئے مگر ان میں سے بائیس حرف کو اس طرح وضع کیا کہ ان میں سے ایک کو دوسرے کے مشابہ ہی نہیں بلکہ بالکل عین رکھا۔ پتا نہیں ملتا کہ "ح" لکھنے کے بعد وہ اس کو کیا کہتا تھا جیم یا حے یا خے؟ غرض واضع حروف نے متشابہ حروف میں جس طرح مابہ الامتیاز کوئی علامت ہر حرف کے ساتھ رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ عہد جاہلیت نہ عہد اسلام کے کسی شخص نے ۶۵ھ سے پہلے اس کو محسوس کیا۔ اسی طرح زیاد اور ابو الاسود دؤلی بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آزاد ہو کر بصرہ چلے گئے تھے ابراہیم نخعی بھی کوفی ہی تھے مجاہد بن جبیر سائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ تھے کہ معظمہ میں عطر فروشی کرتے تھے۔ اور کوفیوں کے مستقل ایجنٹ تھے۔ ان کبار طریقت نے فیصدی کوفی ہی تھے۔ ان کا ذکر قاریوں کے سلسلہ میں آئے گا۔ عاصم بن ابی النجود کوفی تھے اور بڑے قاری۔ بلکہ قاریوں کے استاد۔ اختلاف قراءت کے بڑے بڑے کارخانے کھولے تھے۔ عامر بن شراحیل الکوفی۔ ان کا لقب شعبی مشہور ہے۔ کوفہ کے بڑے مشہور محدث تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف فرائض کے بہت سے مسائل بنا بنا کر منسوب کر کے روایت کیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان سے کچھ سنا بھی نہ تھا۔ بہت سے صحابہؓ سے روایت کرتے تھے مگر ان میں سے کتنے ایسے تھے جن سے کبھی کچھ نہیں سنا تھا لیکن محدثین کے نقطہ نظر سے بہت بڑے عالم اور اپنے وقت کے عبد اللہ بن عباس تھے بہرحال رحمہم اللہ تعالیٰ۔ لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ حجاج پر کفر کا فتوے دینے والے سب کے سب کوفی تھے یا کوفیوں سے تعلقات رکھنے والے اور ان میں بہت بڑی اکثریت غلاموں کی تھی۔ حجاج کی حمایت میرا مقصود نہیں ہے۔ صرف صورت حال میں نے پیش کر دی ہے۔ تاکہ اہل انصاف کو غور کرنے کا موقع ملے۔ ۱۲ تمنا عفی عنہ

بازار سے آٹا دال تو لائے نہیں کھانا پکانے کے لئے پہلے ہی لگے چولہا پھونکنے۔ نقطوں کے بغیر تو حروف ہی کی شخصیت متعین نہیں ہوتی ہے۔ درحقیقت حروف کی تخلیق تو نقطے لگانے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ اعراب تو عارضی چیز ہے۔ ان روایتوں کے بنانے والے اگر کچھ بھی عقل سے کام لیتے تو نقطوں کے وضع کرنے کا سہرا زیاد اور ابوالاسود کے سر باندھتے اور اعراب کی پگڑی عبدالملک اور حجاج کے سر پر رکھتے۔ مگر میں نے اپنے متعدد تنقیدی مضامین میں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ وضاعین وکذابین کی عقلوں پر وضع روایات کے وقت کچھ ایسا پردہ سفاہت ڈال دیتا ہے کہ کچھ نہ کچھ بات ان کی مروّیات یا اسناد روایت میں ایسی رہ جاتی ہے جس کی گرفت ایک نقاد بادنیٰ تامل کر لیتا ہے۔ بشرطیکہ روایت پرستی اس پر مسلط نہ ہو۔ ورنہ بڑے بڑے ائمہ فن رجال اور اساتذہ تنقید روایات جن کی تصنیفوں سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایسی ایسی خلاف عقل ومخالف قرآن مروّیات پر ایمان رکھتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے مخالفت روایت ومعاندت آیت ان کو معلوم بھی ہوتی ہے تو بعید از قیاس اس کی تاویل کر کے اپنے دل کو وہ زبردستی مطمئن کر لیتے ہیں اور دوسروں پر بھی زور دیتے ہیں کہ بس اس تاویل کو مان لو اور روایت کو صحیح تسلیم کر لو۔ چاہے تمہارا دل مطمئن ہو یا نہ ہو۔ اور "عذر گناہ بدتر از گناہ" کی مثل کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ گناہ تو وضاعین وکذابین کر گئے۔ عذر گناہ یہ روایت پرست کرتے رہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی رسم الخط کے واضع نے جب اٹھائیس حرفوں میں سے بائیس حروف اس قدر باہم متشابہ رکھے تھے کہ بغیر نقطہ لگائے لکھنے والا نہ یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ میں نے فلاں حرف لکھا، اور نہ پڑھنے والا یہ یقین کر سکتا تھا کہ یہ فلاں حرف لکھا گیا ہے۔ مثلاً ب، ح، د، ر، س، ص، ط، ع۔ یہ آٹھ شکلیں مفرد ہوں یا مرکب کسی حالت میں بھی متعین نہیں ہو سکتی تھیں کہ یہ کون کون سے حرف ہیں صرف اس لئے کہ ہر شکل ایک سے زیادہ حرفوں کے نام سے موسوم ہے۔ نقطوں سے قطع نظر کرنے کے بعد کوئی بتائے۔ کم از کم "س" ہی کو بتا دے کہ یہ کونسا حرف ہے۔ اور بحالت ترکیب "ما" کی شکل کو بتائے اور "فا" کو بھی۔ آخر پڑھنے والا کیا پڑھے گا۔ اور لکھنے والا بھی ضرور سمجھ سکتا ہے کہ پڑھنے والا حرف کا نام متعین نہیں کر سکے گا۔ پھر عربی رسم خط کا واضع کس طرح ان متشابہ حرفوں کو بغیر نقطوں کے وضع کر سکتا تھا؟

یہ عقلی دلیل تو اتنی قوی ہے کہ واضع نے عربی حروف تہجی پر ضرور نقطے لگائے ہوں گے۔ اور جو صورتیں نقطوں کی اس وقت ان حروف پر ہیں یہ واضع حروف کی وضع کردہ ہیں۔ ہرگز ہرگز کسی نے بعد کو وضع نہیں کیا۔ جو یہ مانتا ہے کہ کئی سو برس کے بعد نقطے لگائے گئے وہ ضرور عقل سے معذور ہے۔ اور ان روایتوں پر ایمان رکھنے والے اس شخص کی طرح ہیں جس کے پاس مخبر نے آکر خبر دی تھی کہ تمہاری بی بی بیوہ ہو گئی ہیں اور وہ یہ سن کر زار وقطار رونے لگا۔ بعد کو لوگوں نے سمجھایا کہ تم تو زندہ ہو تو تمہاری بیوی بیوہ کس طرح ہو جائے گی۔ یہ خبر غلط ہے تو اس نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے مگر جس نے خبر دی تھی وہ نہایت معتبر اور سچا آدمی ہے۔ اس کو ہم جھوٹا نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ضرور بیوہ ہو گئی۔ یہ کہہ کر پھر پیٹنے لگا۔

اس کے بعد کسی دلیل نقلی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ لیجئے کچھ نقلی دلیلیں بھی حاضر ہیں۔ ابن جنی[1]

---

[1] ابوالفتح عثمان بن جنی النحوی الموصلی المتوفی ۳۹۲ھ (مرآۃ الجنان) تمنا عفرلہ

نے بھی اپنے امالی (ص۲۳۷) میں اس کا دعویٰ کیا ہے کہ عربی حروف پر نقطے ابتدائے روز وضع سے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ روایت کہ زمانہ اسلام میں نقطے لگائے گئے جھوٹی روایت ہے۔ انھوں نے جاہلیت کے دو شعر بھی ثبوت میں دیئے ہیں ؎

رمتني بسهم نقّطت منه جفنتي — واذ نقطت عينٌ تذرّف كالغين

محبوبہ نے مجھ کو ایک تیر مارا جس سے میرے پپوٹے پر نقطے جیسا زخم ہو پہنچ گیا — اور جب کسی آنکھ پر نقطہ جیسا زخم لگا تو وہ فوبارہ کی طرح آنسو بہانے لگی

نقطہ، عین، غین کے الفاظ سے جو استعارہ اس شعر میں ہے اس کو ملاحظہ فرمایئے۔ یہ اس زمانے کا شعر ہے جس زمانے میں بقول راویان حقائق تاریخی، حروف تہجی پر نقطے کا وجود ہی نہ تھا نہ کوئی حرفوں کے لئے نقطوں کو جانتا تھا۔

دوسرا شعر بھی ہے ؎

أهي النجوم تعرّضت في سقفها — أم أعجموا اللوحا بغير حروف

کیا یہ آسمان کی چھت پر ستارے چھٹکے ہوئے ہیں — یا حروف کے بغیر کسی نے صفحہ ورق پر خالی بہت سے نقطے لگا دیئے ہیں

اعجام حروف پر نقطے لگانے کو بھی کہتے ہیں اور اعراب لگانے کو بھی۔ اسی لئے نقطہ دار حروف کو معجمہ کہتے ہیں۔

ابن ندیم[1] اپنی شہرہ آفاق کتاب الفہرست کے ص۱۲ میں لکھتے ہیں قال ابن عباس اول من كتب العربية ثلاثة رجال من بولان وهي قبيلة سكنوا الانبار وانهم اجتمعوا ووضعوا احرفا مقطعة وموصولة وهم مرامر بن مرة واسلم بن سدرة وعامر بن جدرة ويقال مروة وجدلة۔ فاما مرامر فوضع الصور واما اسلم ففصل ووصل واما عامر فوضع الاعجام۔ یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے پہلے جس نے عربی رسم خط میں لکھا وہ تین مرد تھے قبیلہ بولان کے جو انبار کے رہنے والے تھے۔ وہ سب یکجا ہوئے اور الگ الگ اور جڑے ہوئے حروف وضع کرنے لگے۔ اور وہ تینوں مرامر مُرّہ کے بیٹے، اسلم سدرہ کے بیٹے، اور عامر جدرہ کے بیٹے تھے۔ اور بعضوں نے مرّہ کے عوض مروہ اور جدرہ کی جگہ جدلہ بھی کہا ہے۔ تو مرامر نے حروف کی صورتیں مقرر کیں۔ اور اسلم نے اس کی جوڑ پیوند اور الگ رہنے کی ہیأت قائم کیں اور عامر نے ان پر نقطے لگائے۔

ص۹ پر حمیری حروف تہجی کی تصویر بھی دی ہے۔ اس میں بھی نقطے موجود ہیں۔ جہاں نقطے نہیں ہیں کوئی دوسری علامت ایسی موجود ہے جو ایک کو دوسرے ہمشکل حرف سے ممتاز کر دے (میں نے توفیق و اعانت رب العلمین کے بھروسے پر اعجاز القرآن حصہ دوم کی تدوین شروع کر دی ہے۔ انشاء اللہ اس میں اس موضوع پر کچھ اور تفصیلی بحث ہوگی) اس مختصر سے مضمون میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ جس قدر لکھ گیا ہوں ایک دیانتدار عاقل کے لئے اسی قدر بہت کافی ہے۔ در خانہ اگر کس است حرفے بس است۔ ورنہ روایت پرستی کی ہٹ دھرمی جن کا شیوہ ہے ان کے سامنے تو جتنی بھی دلیلیں پیش کیجئے وہ کبھی ماننے کے نہیں۔

---

[1] ابو الفرج محمد بن اسحٰق الندیم مصنف کتاب "الفہرست" المتوفی ۳۸۵ھ مگر یہ غالی شیعہ تھے۔ ۱۲ تمنا عفی عنہ

اب مولانا مودودی کروٹ بدلتے ہیں مگر آہستہ آہستہ۔ سنئے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"اگر قرآن کی اشاعت کا دارومدار صرف تحریر پر ہوتا تو جس رسم خط میں امت کو یہ کتاب ملی تھی، اس کو پڑھنے میں تلفظ اور اعراب ہی کے نہیں، متشابہ حروف کے بھی کتنے بے شمار اختلافات ہو گئے ہوتے[1] محض زبان اور قواعد کی بنا پر خود اہل زبان بھی اگر نقطے اور اعراب لگانے بیٹھتے تو قرآن کی ایک ایک سطر میں بیسیوں اختلافات کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کسی ذریعے سے یہ فیصلہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ اصل عبارت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی وہ کیا تھی[2]؟ اس کا اندازہ آپ خود اس طرح کر سکتے ہیں کہ اردو زبان کی کوئی عبارت بے نقط لکھ کر دس بیس زبان داں اصحاب کے سامنے رکھ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کسی کی قرأت بھی کسی دوسرے کے مطابق نہ ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں نقطے اور اعراب لگانے کا کام محض لغت اور قواعد زبان کی مہارت کے بل بوتے پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ایک مصحف نہیں بے شمار مصحف[3] تیار ہو جاتے جن میں الفاظ اور اعرابوں کے ان گنت اختلافات ہوتے اور کسی نسخے کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہ کیا جا سکتا کہ ٹھیک اسی تنزیل کے مطابق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔

اب مولانا مودودی گریز کر کے راہ پر آتے ہیں۔ دیکھئے فرماتے ہیں۔

"اب وہ کیا چیز ہے جس کی بدولت آج دنیا بھر میں ہم قرآن کا ایک ہی متفق علیہ متن پا رہے ہیں اور

---

[1] ہو گئے ہوتے کی ایک ہی کہی۔ کیا اس وقت اختلافات قرأت کا شمار کسی نے کیا ہے؟ اتحاف البشر فی القراءات اربعۃ عشر" اور آٹھ جلدوں میں کتاب نثر المرجان کو پڑھ جایئے اور اختلاف قرأت کو اگر گن سکتے ہوں تو گن کر دکھایئے۔ اور یہ تو وہ اختلافات ہیں جن کو قاریوں نے ارجح یا صحیح قرار دے کر قبول کیا ہے ان سے دس گنا اختلافات تو رد کر دیئے گئے۔ وہ بھی تو آخر روایات ہی کے ذریعہ پیش کئے گئے تھے۔ مگر رد کرنا بھی ضروری تھا۔ سب کو قبول کر لیتے تو ہر شخص کو ضرور شبہ ہوتا۔ اسلئے دس لاکھ اختلافات بنائے گئے اور ایک لاکھ رکھ کر نو لاکھ رد کر دیئے تو اس سے ہر خاص و عام میں ایک اعتماد پیدا ہو گیا۔ جو قابل رد تو در اصل سب تھے۔ ۱۲ تمنا عفرلہ

[2] اس کا علاج تو آسان تھا جس طرح انزل القرآن علی سبعۃ احرف کی حدیث بنائی گئی اسی طرح انزل القرآن علی احرف کثیرۃ لا تحصی کی بھی ایک حدیث گھڑ لی جاتی بلکہ اس کی جگہ یہی حدیث رہتی۔ پھر جس کا جس طرح جی چاہتا اور جو مطلب چاہتا نکالتا۔ ۱۲ تمنا عفرلہ

[3] اس کی کوشش تو بہت کی گئی سات قاریوں کے سات اسکول قائم کئے گئے۔ مصحف ابی بن کعب اور مصحف عبداللہ بن مسعود اور مصحف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کے نام سے مصاحف مشہور کر کے ترتیب سور میں الٹ پلٹ تو کی ہی گئی۔ آیات کے الفاظ میں کمی بیشی اور الفاظ کے تلفظ و اعرابات میں بھی فرق قائم کیا گیا۔ مگر ان کے پاس نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون کا کوئی علاج نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خود ساختہ سارے اختلافات کو ان کی تصنیف کردہ کتابوں اور روایات کے دفاتر تک ہی رہنے دیا۔ کسی ایک اختلاف کو بھی قرآن مجید میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس نے خود فرمایا ہے ان الذین یلحدون فی آیاتنا لا یخفون علینا۔ جو لوگ ہماری آیتوں میں ٹیڑھ کی راہیں نکالیں گے وہ ہم سے کچھ چھپے نہیں رہیں گے۔ (حم سجدہ ع ۵) تمنا عمادی عفرلہ

> جس کی بدولت قرأتوں کے اختلافات امکانی وسعتوں تک پھیلنے کی بجائے صرف چند[1] متواتر یا مشہور اختلافات تک محدود رہ گئے۔ یہ اسی نعمت کا صدقہ ہے جس کی قدر گھٹانے اور جس پر سے اعتماد اٹھانے کے لئے منکرین حدیث ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ یعنی روایت۔

مولانا مودودی راہ پر آتے آتے پھر بہکے۔ اور اپنی اسی روایت پرستی والی منزل پر پہونچ گئے۔ کوئی بتائے کہ روایت والی نعمت جو ان روایت پرستوں کو ملی ہے۔ اس کے صدقے میں ان کو اس موقع پر کیا ملا؟ جو بے محل اس کا ذکر چھیڑ دیا۔ انہی روایتوں کی بنا پر تو اختلافات قرأت کا ایک دریائے ناپیدا کنار موجیں مار رہا ہے۔ اگر یہ سبعۃ احرف والی حدیث موضوع نہ ہوتی اور اس کی بنیاد پر اختلاف قرأت کی روایتوں کی اینٹیں نہ چنی جاتیں تو یہ اختلاف فی القرآن کی سر بفلک عمارتیں (اتحاف فضلاء البشر فی القرأت اربعۃ عشر) الدر نشر المرجان جیسی ضخیم ضخیم کتابوں کے ذریعہ کہاں سے کھڑی ہوتیں۔ اور آج ایک سائل متحیر کو مولانا مودودی سے اختلاف قرأت کے متعلق اپنی تشفی چاہنے کی کیا ضرورت پڑتی؟ یہ واقعہ ہے کہ اگر روایتیں نہ ہوتیں تو مولانا مودودی اور ہمارے علمائے کرام کو اختلافات کثیرہ فی القرآن کی نعمت عظمیٰ کہاں سے ملتی؟ یہ نعمت عظمیٰ تو انہی روایتوں کے صدقے میں ملی ہے۔ اس لئے ہمارے مولاناؤں کو ان تمام راویان روایات اختلاف قرأت کا شکر گزار ہونا چاہیئے اور یہ منکرین حدیث جو ایسی نعمت عظمیٰ کی قدر نہیں کرتے اور جن راویوں کے ذریعہ یہ نعمت عظمیٰ ملی ہے ان کے شکر گزار نہیں ہوتے ہیں تو "کافر ہیں" "مرتد ہیں" اس لئے "واجب القتل" ہیں (تمنا) مگر یہ راویان قرأت کون تھے اور کیسے کیسے تھے جن سے اختلافات فی القرآن کی نعمت عظمیٰ ملی ہے اس کا پورا پتہ تو میری کتاب قُرَّاءُ الامَّۃ کے چھپنے کے بعد ہی ملے گا۔ مگر یہ کتاب عربی زبان میں ہے (عام مسلمین کی اصلاح عقائد کے لئے ضرورت ہے کہ اس کا اردو ترجمہ شائع ہو جائے۔ لیکن کون ترجمہ کرے اور کون شائع کرے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے کسی مخلص بندے کو اس کی توفیق دے کہ وہ محض احسبۃً للہ اس کا ترجمہ کرا کے شائع کرائیں۔ (وعلی اللہ اجرہ) مگر میں کم سے کم قراء سبعہ کا حال تو اس مضمون میں ان شاء اللہ بیان کردوں گا۔ تاکہ سہ قیاس کن زگلستان من بہار مرا کے مطابق قرأتوں کے جو سات اسکول مشہور ہیں اور جن کی قرأتوں کو محض مجبورٹ متواتر مشہور کر رکھا گیا ہے۔ عام مسلمانوں کو ان کا حال معلوم ہو جائے۔ اور اس کا پتہ بھی چل جائے کہ ان کی روایات اختلافات قرأت واقعی مسلمانوں کے لئے نعمت ہیں یا نقمت۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ خود ائمہ رجال کے نزدیک ان کا کیا درجہ ہے۔ اسی نعمت عظمیٰ کا ذکر کر کے ارشاد ہے۔

> "اور جن دو تاریخی حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے (جن کی حقیقت ناظرین کو معلوم ہو چکی ہے) ان کے علاوہ ایک تیسری اہم ترین تاریخی حقیقت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی اشاعت ابتداءً تحریری صورت

---

[1] سہ چند: آپ کہہ رہے ہیں؟ کم سے کم دس ہزار اختلافات آج قرأت کی بڑی بڑی کتابوں میں موجود ہیں جن کو قاریوں نے قبول کر لیا ہے۔ قرأت مردودہ سے قطع نظر کر کے اور متواتر تو قرآن مجید سے باہر ایک قرأت بھی نہیں۔ متواتر تو یہی ہے جس کو ساری دنیا پڑھ رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک لفظ کے متعلق کوئی دوسری قرأت متواتر نہیں دکھائی جا سکتی۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ اگر تم لوگ سچے ہو تو اپنی دلیلیں پیش کرو۔ ۱۲ تمنا عفولہ

میں نہیں بلکہ زبانی تلقین کی صورت میں ہوتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی آیات نہیں عبارت کو کاتبانِ وحی سے لکھوا کر محفوظ تو ضرور کرا دیا تھا۔ لیکن عوام میں اس کے پھیلنے کا اصل ذریعہ یہ تھا کہ لوگ براہِ راست حضورؐ کی زبان سے سنکر قرآن یاد کرتے تھے۔ اور پھر حضورؐ سے سیکھنے والے آگے دوسروں کو سکھاتے اور حفظ کراتے تھے۔ اس طرح قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب جو تنزیل کے مطابق تھا ہزارہا آدمیوں کو حضورؐ سے معلوم ہوا۔ اور پھر لاکھوں آدمیوں کو حضورؐ کے شاگردوں کی زبانی تعلیم سے حاصل ہوا۔ صحابہ کرامؓ میں ایک معتدبہ گروہ ایسے اصحاب کا تھا جنھوں نے پورا قرآن لفظ بلفظ حضورؐ سے سنا تھا اور یاد کیا تھا۔ ہزارہا اصحاب ایسے تھے جو قرآن کے مختلف اجزاء حضورؐ سے سنکر یاد کر چکے تھے۔ اور ایک بہت بڑی تعداد ان صحابیوںؓ کی تھی جنھوں نے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں تو آپؐ سے صرف بعض اجزائے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر آپؐ کے بعد پورے قرآن کی قرأت لفظ بلفظ ان اصحاب سے سیکھی جو حضورؐ سے اس کو سیکھ چکے تھے۔ یہی اصحاب وہ اصل ذریعے تھے جن کی طرف بعد کی نسل نے قرآن کی صحیح قرأت (READING) معلوم کرنے کے لئے رجوع کی۔ اس قرأت کا حصول محض لکھے مصحف سے ممکن نہ تھا۔ یہ چیز صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی تھی کہ مصحف مکتوب کو ان جیتے جاگتے مصاحف سے پڑھ کر اس کی اصل عبارت تک رسائی حاصل کی جائے۔"

مولانا مودودی اس نعمتِ عظمیٰ کا فرما کر جو راویان روایات اختلافاتِ قرأت سے انہیں ملی ہے جب فریضۂ تحدیثِ نعمت سے سبکدوش ہو چکے تو پھر ان دو تاریخی حقیقتوں کو انھوں نے یاد دلایا ہے جن کو نگاہ میں رکھ کر دیکھنے کا وہ پہلے حکم دے چکے ہیں۔

(۱) ۶۵ھ تک قرآن کے حروف بلکہ پورے اہلِ عرب ہی عام حروفِ عربی کے لئے اعراب کے نام سے آشنا نہ تھے۔ ابوالاسود دؤلی نے زیاد کے حکم سے پہلے پہل نقطوں کی شکل میں حروف کے اوپر نیچے اور بیچ میں ایک ایک نقطہ رکھ کر زیر زبر پیش سے مسلم اہلِ عرب کو ۴۵ھ سے ۵۳ھ کے اندر کسی دن آشنا کیا۔

(۲) اہلِ عرب حروف کے لئے نقطے بھی پہلے چاہیں اس کو کبھی محسوس نہ کر سکے تھے۔ بلکہ اسلامی عہد میں بھی صحابہؓ۔ رسولؐ، جبریلؑ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حروفِ تہجی کے لئے محسوس نہیں کی تھی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج نے دو گمنام عالموں کے ذریعہ یہ بے ضرورت ایجاد کر کے دنیائے عرب کو اس کی ضرورت سے آشنا کر دیا۔ بس اسی وقت سے عربی حروف کے لئے نقطوں کی ضرورت دنیا کو محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس سے پہلے یہ بالکل بے ضرورت ہی تھے۔ ورنہ اگلوں میں سے کسی کو تو اس کی فکر ہوتی۔ مگر ان دونوں حقیقتوں کی حقیقت آپ پر پوری طرح روشن ہو چکی ہے۔

اس کے بعد تیسری حقیقت کی طرف مولانا نے سائل اور ناظرین ترجمان القرآن کو متوجہ فرمایا ہے کہ ابتداءً صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہر وحی منزل کو لکھوا لیا کرتے تھے۔ اور کوئی بھی قرآن کی کوئی سورت یا کوئی آیت لکھ کر اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ صرف زبانی تعلیم کا رواج تھا۔ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زبانی قرآن سن سن کر سیکھ سیکھ کر یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس لئے ہر صحابی کو قرآن کی تعلیم زبانی ہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے کسی صحابیؓ سے ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ہر صحابیؓ کو اسی طرح قرآن یاد ہوا جس طرح قرآن اترا تھا۔

غرض مولانا مودودی نے سائل کے سوال کے دونوں ٹکڑوں کا تشفی بخش جواب دیدیا۔ کہ اختلاف قرأت کی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے نہ حرفوں پر نقطے تھے نہ اعراب لگانے کا دستور تھا۔ اس لئے بے نقط و اعراب عبارت کو کسی نے کسی طرح پڑھا کسی نے کسی طرح پڑھا۔ اختلافات ہونے کی وجہ نقطوں اور اعراب کا نہ ہونا تھا یہ تو ماحصل تھا پہلی دونوں تاریخی حقیقتوں کا۔ جس سے اختلافاتِ قرأت کے پیدا ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی۔ اور کافی روشنی پڑ گئی۔

تیسری حقیقت کا بیان فرما کر آپ نے اس کا باعث بتا دیا کہ ساری دنیا میں جو ایک ہی قرآن پورے چودہ سو برس سے علی سبیل التواتر ہر زمانے میں ہر شہر میں بلکہ ہر مسلم گھر میں چلا آرہا ہے جس میں ایک شوشے ایک نقطے میں بھی اختلاف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں بلکہ جمع صدیقیؓ کے فعل تک خلافتِ صدیقیؓ میں بھی قرآن مجید کی کتابت کوئی نہیں کرتا تھا سب دوسرے سے زبانی سیکھتے اور یاد کرتے تھے۔ بلکہ صدیق اکبرؓ نے بھی جو ایک نسخہ مصحف زید بن ثابت سے لکھوایا اور اس کو بھی انھوں نے اپنے پاس مقفل ہی رکھا۔ کبھی کسی کو دکھایا تک نہیں، کوئی اس میں پڑھتا کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد بھی حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس جو وہ مصحفِ صدیقیؓ پہنچا تو وہ اس کو اسی طرح کتاب مکنون سمجھ کر چھپائے رکھے رہے۔ ان کے بعد اسی طرح وہ مصحف حضرت عثمانؓ کو ملنا چاہیئے تھا۔ مگر ان کو نہ ملا۔ برخلاف قیاس خدا جانے کیوں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہونچ گیا۔ اور وہاں بھی اسی طرح مقفل ہی رہا۔ جب حضرت عثمانؓ نے سنہ ۲۵ھ[1] میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے یہاں سے وہ مصحف یا صحفِ صدیقیؓ بقول ابن شہاب زہری منگوا کر اس کی نقلیں کرائیں۔ جب کبھی قرآن کی کتابی صورت لوگوں کی نظروں کے سامنے آئی۔ غرض مولانا مودودی کے فحوائے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۲۵ھ تک قرآن کتابی صورت میں نہیں آیا تھا بجز مصحفِ صدیقیؓ کے جو برابر کتاب مکنون ہی رہا۔ کسی نے کبھی اس کی زیارت کی خواہش ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی یا ہمت نہیں پڑی۔

تو جب عہد عثمانیؓ نہیں عہد فاروقیؓ تک یا عہد صدیقیؓ تک یا عہد نبویؐ ہی تک سہی صرف زبانی ہی تعلیم قرآن کا دستور تھا۔ کوئی شخص لکھتا ہی نہ تھا کہ لکھی کتاب میں نقطے اور اعراب نہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے والا گھبراتا کہ کیا پڑھیں؟ اور ایک سے زیادہ پڑھنے والے اختلاف کرتے تو پھر یہ اختلافِ قرأت کہاں سے آگیا؟

مولانا مودودی کی ایک تیسری حقیقت نے تو ان کی بیان کردہ پہلی دونوں تاریخی حقیقتوں کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔

---

[1] حسب حساب صحیح اور بقول ابن حجر سنہ ۲۵ھ میں۔ (تنا)

یقیناً آپ کہیں گے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں مسلمانوں کے پاس مصاحف تھے جبھی تو حضرت عثمانؓ نے جہاں جہاں مصحف بھیجا وہاں وہاں یہ بھی لکھا بھیجا کہ ہر شخص اپنے مصحف کو اسی کے مطابق کرے اور جس نسخے میں زیادہ اختلاف ہو اس کو جلادے۔ اس لئے اس تاریخی حقیقت سے کس طرح انکار کیا جائے گا۔ پھر بخاری کی روایت ہے کہ چار انصاری صحابیوں نے عہد نبویؐ ہی میں مکمل قرآن کتابی صورت میں لکھ لیا تھا۔ بلکہ آغاز نبوت ہی میں صحابہؓ اپنے پاس نازل شدہ آیات و سور لکھ لکھ کر رکھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بہن کے یہاں مصحف دیکھ کر متعدد سورتوں کی مختلف آیتوں سے متاثر ہوئے تھے اور ایمان لائے تھے۔ وہ مصحف حضرت خبیبؓ کا تھا جو وہاں لے کر وہ لے گئے تھے۔ اس لئے عہد نبویؐ میں قرآن کے لکھنے کا اور لکھ کر اپنے پاس رکھنے کا اور اس میں تلاوت کرنے کا بہت کافی دستور تھا۔ ہر لکھا پڑھا صحابیؓ اپنے پاس مصحف رکھتا تھا۔ ازواج مطہراتؓ میں سے ہر ایک کے پاس مصحف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو قرآن دیکھ کر پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اگر قرآن کتابی صورت میں لکھا ہوا لوگوں کے پاس نہ تھا تو کتاب دیکھ کر پڑھنے کی ترغیب کیوں دی جاتی؟ اور آپؐ صحابہؓ کو قرآن ساتھ لے کر سفر کرنے سے کیوں منع فرماتے تھے؟ ان تمام باتوں سے تو صاف ثابت ہو رہا ہے کہ عہد نبویؐ میں قرآن کی کتابت کا عام دستور تھا اور ہر لکھا پڑھا صحابیؓ قرآن لکھ کر اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور ترغیب نبویؐ کے مطابق کتاب دیکھ دیکھ کر پڑھتا تھا[1]۔ تو وہ مولانا مودودی کی یہ تیسری حقیقت بھی تو ان دونوں پہلی تاریخی حقیقتوں کی طرح بالکل بے حقیقت ہی نکلی۔ تو پھر اصل حقیقت کیا ہے؟

میں اس کا جواب آپ کو آخر میں دوں گا۔ ابھی مولانا کی گہر افشانیوں کی سیر تو ختم کر لیجیے۔ مگر اپنے اس سوال کو اور میرے وعدے کو یاد رکھیے۔ میں "اصل حقیقت" ہی کی سرخی کے ماتحت انشاء اللہ آپ کو تشفی بخش جواب دوں گا۔

مولانا اس کے بعد چوتھی تاریخی حقیقت بیان فرماتے ہیں۔ سنیئے۔

> "یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کے جو مستند نسخے لکھوا کر مملکت کے مختلف مراکز میں رکھوائے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ایک ماہر قرات کو بھی مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ ان نسخوں کو ٹھیک طریقے سے لوگوں کو پڑھنا سکھائے۔ مدینے میں زید بن ثابتؓ اس خدمت پر مقرر تھے۔ مکہ میں عبداللہ بن سائبؓ

---

[1] طلوع اسلام میں قطعی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم (اسی شکل میں جس میں اب یہ ہمارے پاس ہے) خود مرتب کرا کر اور لکھوا کر اُمت کو دیا تھا۔ یہ مضمون بعد میں "مقام حدیث" میں شامل کر دیا گیا تھا۔ (طلوع اسلام)

[2] معلوم نہیں یہ کہاں کی روایت ہے۔ صحاح میں تو کہیں نہیں۔ مسند احمد میں بھی نہیں۔ اور بقول ائمہ حدیث جو روایت مسند احمد میں نہیں تو اس کو ضرور جھوٹی روایت سمجھنا چاہیئے۔ غالباً "جمع القرآن" والی میری کتاب میں میرا اعتراض دیکھ کر مولانا مودودی نے اپنی طرف سے یہ بات بڑھائی ہے جس کا کوئی ثبوت وہ کسی روایت سے نہیں دے سکتے۔ حتیٰ کہ اتقان میں بھی اس کا کہیں ذکر نہیں۔ میرا اعتراض میری کتاب "احادیث جمع قرآن کی بے لوث تنقید" میں دیکھئے۔ ۱۲ تمنا غفرلہ (علامہ صاحب کا یہ مضمون طلوع اسلام بابت اگست، ستمبر سنہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ طلوع اسلام)

کو خاص طور پر اسی کام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ شام میں مغیرہ بن شہاب، کوفے میں ابو عبدالرحمٰن السلمی اور بصرے میں عامر بن عبدالقیس اس منصب پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جہاں جو صحابیؓ بھی حضورؐ سے براہ راست یا آپ کے بعد قراء صحابہ سے قرآن کی پوری قرأت سیکھے ہوئے تھے اُن کی طرف ہزارہا آدمی اس مقصد کے لئے رجوع کرتے تھے کہ قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب لفظ بلفظ ان سے سیکھیں۔

معلوم نہیں مولانا نے اس چوتھی بات کو جو ان کے اور بہت سے متقدمین و متاخرین کے نزدیک تاریخ سے ثابت ہے اس کو "چوتھی تاریخی حقیقت" کہہ کر کیوں پیش نہیں فرمایا؟ مگر جب یہ تاریخ سے ثابت ہے تو یقیناً ان کے نزدیک یہ ضرور "چوتھی تاریخی حقیقت" ہے۔ تو اس چوتھی تاریخی حقیقت کی حقیقت اگر آپ کو معلوم کرنا ہو تو میری کتاب "احادیث جمع قرآن کی بے لوث تنقید" جو ماہ اگست ستمبر ۱۹۵۲ء کے طلوع اسلام کے مشترکہ پرچے میں چھپی ہے اس کے صفحہ ۱۰۹ سے صفحہ ۱۲۹ تک صرف دس ورق کے بغور مطالعہ کی زحمت گوارا کر لیجئے۔ آپ کو اس چوتھی حقیقت کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ نقل مصاحف بعہد عثمانؓ والی حدیث ہو یا جمع صدیقیؓ والی، بخاری میں ہے یا ترمذی میں یا نسائی وغیرہ میں۔ بالکل موضوع اور منافقینِ عجم کی من گھڑت ہے جو صحیح بخاری و ترمذی و نسائی میں داخل کر دی گئی ہے ان جامعین احادیث کی وفات کے بعد۔ جس پر مکمل بحث میری اس کتاب "بے لوث تنقید" میں موجود ہے۔ میرے اعتراضوں کا جواب میرے دلائل کی تردید آج تک کسی سے نہ ہو سکی۔ اور انشاء اللہ المستعان قیامت تک نہ ہو سکے گی۔

تصنیفِ تاریخ مولانا مودودی نے خود یا جس کتاب سے انھوں نے نقلِ مصاحف عثمانی کا واقعہ نقل کیا ہے اس کے مصنف نے یہ واقعہ تصنیف کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جو مملکت اسلامیہ کے مراکز میں مصاحف بھیجے تھے۔ ہر جگہ اس مصحف کے ساتھ ایک قاری معلم بھی بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو صحیح تلفظ اور صحیح اعراب بتائے ورنہ صحیح بخاری وغیرہ کتب احادیث معتبرہ میں کہیں قاریوں کے بھیجنے کا ذکر نہیں۔ صرف مصحف بھیجنے کا ذکر ہے اور ہر جگہ کے لوگوں کو یہ کہا گیا تھا کہ تم اسی نسخہ مصحف کے مطابق اپنے اپنے مصاحف کو بنا لو۔ اور جو مصحف اس کے خلاف ہو اس کو جلا دو۔ ہر جگہ کے لوگوں نے خلیفۂ وقت کے حکم کی تعمیل کی بجز اہل کوفہ کے۔ اس لئے کہ حسب روایت ابن خلدون وغیرہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے مصحف کو نہیں بدلا اور اپنے شاگردوں کو بھی تاکید کی کہ تم لوگ اپنے مصحف کو نہ بدلو۔ ہر شخص اپنے مصحف پر قائم رہے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر یہ اتہام ہے۔ وہ تو ۳۲ھ بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی کوفے سے مدینے چلے آئے تھے۔ ۳۰ھ میں انھوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ حج کیا تھا۔ اور نقلِ مصاحف کا واقعہ جو کہا جاتا ہے وہ صحیح حساب سے ۳۱ھ کا ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ میں موجود ہی نہ تھے جو اپنے شاگردوں کو کہتے کہ اپنے مصاحف کو اُن کے حال پر رہنے دو۔ مصحفِ عثمانی کے مطابق نہ بناؤ۔ باقی رہا ابن حجر کا روایت کاذبہ کی حمایت میں یہ کہنا کہ نقل مصاحف کا واقعہ ۲۵ھ کا ہے ۳۰ھ کا نہیں تاکہ جو اقوال حضرت عبداللہ بن مسعود کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ صحیح ثابت ہوں بالکل غلط ہے جس کو ہم "بے لوث تنقید" کے صفحہ ۱۲۳ میں لکھ چکے ہیں۔

ایک استدراک احادیث جمع قرآن کی بے لوث تنقید کے صفحہ ۱۲۲ کی آخر سطر کے اوپر والی سطر پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نام پر "سلہ" کے حاشیے کی علامت بنی ہوئی ہے اور نٹ نوٹ میں لکھا ہوا ہے کہ "سلہ حاشیہ ہذا صفحہ آئندہ کے حاشیہ میں شریک ہے"۔ مگر صفحہ آئندہ پر کوئی حاشیہ ہی نہیں۔ بلکہ یہ حاشیہ کسی صفحہ پر بھی منقول نہیں اور وہ ضروری حاشیہ ہے۔ پھر یہاں جو مضمون زیر بحث ہے اس سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں یہاں اس حاشیہ کو اپنے مسودے سے نقل کر دیتا ہوں۔

سلہ (حاشیہ صفحہ ۱۲۲ جمع قرآن دبے لوث تنقید) سعیدؓ بن العاصی نے سنہ ۳۰ھ کے اواخر یا سنہ ۳۱ھ کے اوائل یا وسط میں اہل کوفہ کو جمع کر کے حضرت عثمانؓ کے بھیجے ہوئے مصحف کو ان کے سامنے پیش کیا اور حضرت عثمانؓ کا حکم سنایا کہ سب لوگ اپنے مصاحف کو اسی مصحف کے مطابق بنالیں۔ فتح ارمینیہ و آذربیجان کو ابو جعفر الطبری سنہ ۲۲ھ کا واقعہ بتلاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ساری باتیں سنہ ۲۲ھ ہی میں ہوگئیں بلکہ ۲۳ھ کے اواخر میں ارمینیہ وغیرہ فتح ہوا ہے۔ حذیفہ بن یمان متوفی سنہ ۳۶ھ نے سنہ ۲۵ھ میں کوفہ اور شام و عراق کے لوگوں کو قرآن مجید میں باہم اختلاف کرتے اور لوگوں کو طرح طرح سے پڑھتے دیکھا تو یقیناً پہلے سمجھایا ہوگا۔ منع کیا ہوگا۔ صحیح پڑھنے والوں سے ان کے سامنے پڑھوا کر ان سے سنوا کر اتمام حجت کی صورت نکالی ہوگی۔ جب وہ لوگ کسی طرح نہ مانے ہوں گے تو مجبوراً خلیفہ وقت کو خبر کرنے کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ اور اس میں سنہ ۲۵ھ ختم ہو گیا ہوگا۔ یا شاید سنہ ۲۵ھ ہی کے اواخر میں انہوں نے آ کر حضرت عثمانؓ کو خبر دی ہوگی۔ حضرت عثمانؓ نے سنہ ۲۶ھ میں اکابر صحابہؓ جو اس وقت مدینے میں موجود تھے ان سے مشورہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد نقل مصاحف کا انتظام کیا ہوگا۔ نقل مصاحف کا کام بھی کوئی آسان کام نہیں ہے کہ مہینے دو مہینے میں ہو جائے۔ میں اگرچہ ان سب واقعات و روایات کو غلط اور بے بنیاد اور اختلاف قرآت کے قائم کرنے کی تمہید سمجھتا ہوں۔ مگر سر دست تو بحث بیان کردہ تاریخی "حقائق بے حقیقت" پر ہے تو قریش و غیر قریش کے جتنے اختلافات تھے ان کے طے کرنے میں۔ اور ایک بات منقح کرنے میں، ہر اختلاف کے فیصلے میں اور پھر فیصلے کے مطابق پہلے ایک مسودہ مرتب کر لینے میں اور اس کے بعد اس کی متعدد نقلیں کرنے میں کافی وقت صرف ہوا ہوگا۔ اس لئے اگر نقل مصاحف کا سال سنہ ۳۰ھ میں ابن خلدون نے لکھا ہے تو کیا غلط لکھا ہے۔ اس کے بعد مختلف مراکز میں ایک ایک مصحف بھیجا گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ سنہ ۳۱ھ میں ہر جگہ مصحف پہنچا ہو۔ اور کوفے میں بھی سنہ ۳۰ھ کے اواخر یا ۳۱ھ کے اوائل میں پہنچا ہو۔ مگر یہ سب تاویلیں اور توجیہیں تو ابن جریر و ابن حجر کے اس قول کو تسلیم کر لینے کے بعد ہیں کہ فتح ارمینیہ سنہ ۲۵ھ میں ہوئی۔ "البدایۃ والنہایۃ" میں سنہ ۳۱ھ کے ضمن میں ابن اثیر لکھتے ہیں فی ھذہ السنۃ فتحت ارمینیہ اسی سنہ ۳۱ھ میں ارمینیہ فتح ہو۔ ج ۵، ص ۱۵۸۔ ابن خلدون

سلہ کتاب جمع القرآن میں اس جگہ صفحہ ۱۲۲ میں "نقل مصاحف کی تاریخ" کے زیر عنوان کی جگہ کتابت کی غلطی سے "سعید بن العاصی" کی جگہ "سعید بن ربیعہ" چھپ گیا ہے اس غلطی کی تصحیح ضروری تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ موقع نکال دیا۔ فالحمد للہ۔ ۱۲ تمنا عفی عنہ۔

سلہ البدایۃ والنہایۃ لابن اثیر ص ۱۵۸ جلد پنجم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح ارمینیہ سنہ ۳۱ھ میں ہوئی اور عبدالرحمن بن ربیعہ کی شہادت اور ان کی جگہ سلمان بن ربیعہ کا تقرر سنہ ۳۲ھ میں ہوا۔ اور نقل مصاحف کا واقعہ سلمان بن ربیعہ کے تقرر کے بعد ہوا ہے۔ ۱۲ تمنا عفی عنہ۔

وابن اثیر نے یقیناً ابن جریر کی تحریر بھی ضرور دیکھی ہوگی۔ اس لئے اس کے خلاف بھی لکھا کہ تحقیق اس کے خلاف ہوئی۔ اسی بناء پر میں نے "تعین تاریخ نقل مصاحف" کے زیر عنوان ابن خلدون کی وہ روایت کہ جب سعید بن العاصی نے اہل کوفہ کے سامنے حضرت عثمان کا بھیجا ہوا مصحف پیش کر کے سبکو حکم دیا کہ ہر شخص اپنے مصحف کو اسی کے مطابق بنالے اور اختلافات کو بالکل مٹادے اس وقت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے شاگردوں کو اس سے منع کیا اور سب کو اختلافات کے لئے باقی رکھنے کی تاکید کی وغیرہ باتیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر تہمت ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ واقعہ بہرحال ۳۰ھ بلکہ اس کے بھی کئی سال بعد کا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۳۲ھ کے پہلے ہی کوفے سے مدینے بلالئے گئے تھے ۲۹ھ میں انھوں نے حضرت عثمان کے ساتھ حج کیا تھا اور پھر برابر مدینہ ہی میں رہے۔ یہ من گھڑت داستانیں۔ جمع قرآن بعہد صدیقی کی۔ پھر نقل مصاحف بعہد عثمانی کی۔ اور پھر ہر جگہ کے لوگوں کا اپنے اپنے مصحف کو مصحف عثمانی کے مطابق بنالینے۔ صرف اہل کوفہ کے حسب ہدایت عبداللہ بن مسعودؓ اختلافات کو باقی رکھنے وغیرہ کی صرف اس کی تمہید ہے کہ اختلافات قرأت کی تخم ریزی جو کوفے میں ملاحدہ عجم نے کی اور پھر اس کو ایک تناور درخت رفتہ رفتہ بنادیا وہ صحیح ثابت ہوا اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا نام استعمال کیا گیا۔

چونکہ ابن جریر خود ایک عجمی اور شیعہ تھے بلکہ عجمی سازش کے ایک رکن رکین تھے۔ اس لئے انھوں نے فتح ارمینیہ کو ۲۲ھ کا واقعہ لکھا تاکہ یہ سب داستانیں جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے متعلق بنائی گئی ہیں وہ ان کے کوفے سے مدینہ چلے آنے کے قبل کی سمجھی جاسکیں۔ اور ان باتوں کی نسبت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف صحیح سمجھی جاسکے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر جو بہتانات اس سلسلے میں کوفیوں نے کئے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر میری کتاب جمع قرآن کے ص ۹۷-۹۶ میں بھی ہے۔

انتخاب معلمین

بقول مولانا مودودی مدینے کے لئے معلم قرآن حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ کو مقرر کیا اور مکہ کے لئے عبداللہ بن سائبؓ کو۔ اگرچہ زید بن ثابتؓ سے زیادہ با اثر اور اعلم بالقرآن قریشی لب و لہجہ سے واقف صحابہ مدینہ میں موجود تھے۔ ان کے ہوتے زید بن ثابتؓ کا انتخاب ہرگز مناسب نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ کاتب وحی و کاتب مصحف صدیقی و ناقل مصاحف بعہد عثمانی قرار دیئے گئے ہیں ان کی اس صحیح یا غلط شہرت کی بنا پر ان کا انتخاب غلط نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اور عبداللہ بن السائبؓ مخزومی تھے تو مکی مگر قریشی غالباً نہ تھے۔ اس لئے کہ دو قبیلے مخزومی کہے جاتے ہیں جن میں سے ایک قریشی تھے۔ سمعانی نے انساب میں ان کا ذکر کیا ہے اور متاخرین کے نام گنے ہیں۔ یہ تو صحابی تھے اور پھر مکہ کے قاری تھے ضرور ان کا نام بھی وہ اس ضمن میں لکھتے۔ اس کے علاوہ جو شخص مخزومی قریشی ہو اس کے نام کے ساتھ مخزومی قریشی تمیز کے لئے ضرور لکھتے ہیں۔ لیکن ان کا، ان کے والد کا ان کے خاندان کے متعدد اشخاص کا ذکر تہذیب التہذیب میں ہے۔ لیکن کسی جگہ کسی کو بھی قریشی نہیں لکھا ہے۔ اس لئے قرینہ غالب یہی ہے کہ یہ غیر قریشی تھے۔ بہرحال چونکہ اہل کوفے نے جو قاریوں کا جال ہر جگہ بچھایا تھا اس کے مطابق ان کو بھی مکہ کا قاری مشہور کیا گیا تھا۔ اور مجاہد جو انھیں کے والد کے آزاد کردہ غلام تھے اور مکہ معظمہ میں کوفیوں کے ایجنٹ بھی تھے۔ انہی مجاہد کو عبداللہ بن السائب کا شاگرد قرار دے کر ان کی طرف بھی کچھ اختلافات قرأت کی نسبت کی گئی ہے۔ اس لئے صناعید قرأت ہی نے حضرت عبداللہ بن السائبؓ کو مکے کا قاری مشہور کیا ہے۔ مولانا مودودی نے اس کو غنیمت سمجھ کر یہ لکھ دیا کہ حضرت

عثمانؓ نے ان کو اپنے مصحف کے مطابق تعلیم قرآن کے لئے کا قاری مقرر کیا تھا۔ اگر واقعی زید بن ثابت مدینے کے اور عبداللہ بن السائب مکے کے قاری حضرت عثمانؓ کے مقرر کئے ہوتے اور دونوں کو مصحفِ عثمانی ہی کے مطابق تعلیم قرآن کا حکم ہوتا تو اہل مکہ و اہل مدینہ کی قراءتوں میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ باقی رہے ابوعبدالرحمن السلمی یہ کوفی تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے تھے۔ غایت سے غایت ایک تابعی تھے۔ کیا حضرت عثمانؓ کو کوئی صحابی اُس وقت نہ ملتا تھا کہ ایک غیر قریشی تابعی کو تعلیم قرآن کی اہم خدمت پورے علاقے کے لئے سپرد کی؟ اور وہ بھی ایک کوفی ہی کو؟ یہی کوفی عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردانِ رشید تو اختلافات پیدا کر رہے تھے۔ یہاں تو مدینے سے کسی خاص قریشی صحابی کو تعلیم قرآن کے لئے بھیجنا تھا تاکہ وہ اختلافات مٹائے۔ اصل یہ ہے کہ ان کو بھی کوفی ملاحدۂ عجم نے اختلافاتِ قرأت کے لئے استعمال کیا ہے اور ان کا نام بھی اپنے دفتر میں ٹانک لیا ہے۔ اور کوفے کا امام القراء بنا کر مشہور کیا ہے۔ اس لئے مولانا مودودی نے بھی ان کو حضرت عثمانؓ کا مقرر کیا ہوا قاری بنا دیا۔

باقی رہ گئے دو آدمی۔ مغیرہ بن شہاب جو شام کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اور عامر بن عبدالقیس جو بصرے کیلئے حضرت عثمان کی طرف سے بقول مولانا مودودی مقرر کئے گئے تھے۔ یہ دونوں صحابی تو سرے سے نہیں ہیں۔ کوئی مشہور و معروف تابعی بھی نہیں نہ امام ذہبی ان کا ذکر کہیں کرتے ہیں نہ ابن حجر۔ یہ دونوں کوفے کے قاریوں کے ساختہ و پرداختہ امام القراء ہیں۔ قاریوں کے زمرے میں ان دونوں کا نام دیکھ کر ان دونوں کو بھی حضرت عثمانؓ کا مقرر کردہ قاری بنا دیا۔ اس وقت تو سینکڑوں صحابہؓ موجود تھے جنھوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھا تھا۔ ایسے گمنام غیر معروفوں کا تقرر ضرور قابلِ لحاظ ہے۔

اس کے بعد مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں۔

> ان عام معلمین قرآن کے علاوہ تابعین و تبع تابعین کے عہد میں ایک گروہ ایسے بزرگوں کا بھی پیدا ہو گیا، جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ قرأت قرآن میں اختصاص پیدا کیا۔ یہ لوگ ایک ایک لفظ کے تلفظ، طریق ادا اور اعراب کو معلوم کرنے کے لئے سفر کر کے ایسے اساتذہ کے پاس پہنچے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر نسبتِ تلمذ رکھتے تھے۔ اور ہر ہر لفظ کی قرأت کے متعلق یہ نوٹ کیا کہ اسے انھوں نے کس سے سیکھا ہے اور ان کے استاد نے کس سے سیکھا تھا؟ اسی مرحلے میں یہ بات تحقیق ہوئی کہ مختلف صحابیوں اور ان کے شاگردوں کی قرأت میں کہاں کہاں اور کیا کیا اختلافات ہیں۔ ان میں سے کون سے اختلاف شاذ ہیں اور کون سے مشہور ہیں یا کون سے متواتر ہیں۔ اور ہر ایک کی سند کیا ہے؟ دوسرے اختلافات کیوں پیدا ہوئے؟ اس کی وجہ ان بزرگوں سے کسی نے نہیں پوچھی، تمنا) پہلی صدی کے دورِ آخر سے لے کر دوسری صدی تک اس طرح کے ماہرین قرأت کا ایک گروہ کثیر دنیائے اسلام میں موجود تھا۔ مگر ان میں سے خاص طور پر جن لوگوں کا کمالِ علم تمام امت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ حسب ذیل سات اصحاب ہیں جو قراء سبعہ کے نام سے مشہور ہیں۔
>
> (۱) نافع بن عبدالرحمن المتوفی ۱۶۹ھ۔ اپنے وقت میں مدینے کے رئیس القراء مانے جاتے تھے۔ ان کا سبب

زیادہ معتبر سلسلہ تلمذ یہ تھا کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا تھا۔ انھوں نے ابی بن کعبؓ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

واقعہ یہ ہے کہ سارے اختلافات قرأت کوفے کی ٹکسال میں گھڑے جاتے تھے۔ اور پھر اپنے مراکز ان ملاحدہ عجم کوفیوں نے بنا رکھے تھے اور ہر مرکز میں اپنے ایجنٹ مقرر کر دیئے تھے۔ پوری طرح سوچ بچار کر کے کس اختلاف کو کس کی طرف منسوب کیا جائے اور اس کے لئے کون کون سے سلاسل اسناد جوڑے جائیں۔ جب آپس میں بانٹ طے کر لیتے تھے، تو اس کے مطابق ان خود ساختہ اختلافات قرأت کو خود ساختہ اسناد کے ساتھ مراکز میں بھجوا دیتے تھے۔ سب سے پہلے "انزل القرآن علی سبعۃ احرف۔ قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے" یہ حدیث گھڑی جا چکی تھی اور اس کی اشاعت بھی پوری طرح کی جا چکی تھی۔ لیکن یہ سب بہت بعد کو کم و بیش تیسری صدی میں ہوا۔ اس سے پہلے اختلاف قرأت کا مطلق وجود ہی نہ تھا۔ صرف عجمی سازشی مصنفین اپنی کتابوں میں کہیں کہیں بعض اختلافات کا ذکر کر جاتے تھے۔ مگر سبعۃ احرف والی حدیث کا پرچار البتہ پہلی صدی کے اواخر یا دوسری صدی کے آغاز سے شروع ہو گیا تھا۔ اب ہم ان کے قراء سبعہ جو تمام ائمہ قرأت میں سب سے زیادہ ممتاز رہے اور ہیں۔ اب ان کی حقیقت ناظرین پر واضح کرتے ہیں۔ نافع بن عبدالرحمٰن جو ان لوگوں کے نزدیک مدینہ طیبہ کے امام القراء اور سب سے بڑے قاری تھے۔ ان کا نام آ چکا ہے۔ اس لئے پہلے انہیں کو لیجئے۔

نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم

یہ قبیلہ بنی لیث میں سے کسی شخص کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور بعضوں نے قبیلہ جعونہ کا غلام لکھا ہے۔ اصفہانی تھے۔ ان کے والد ابو نعیم اور ان کے دادا کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ان کے والد اور ان کے دادا نے ساتھ ساتھ ہی اسلام قبول کیا تھا اس وقت یہ کمسن تھے۔ ان کی خود کنیت ابو رویم بھی ہے اور ابو عبدالرحمٰن بھی۔ ان کے دادا کا اسلامی نام نعمان رکھا گیا تھا اور ابو نعیم کنیت۔ مگر کنیت ہی سے وہ زیادہ مشہور ہوئے۔ نافع کی نسبت کبھی باپ کی طرف کبھی دادا کی طرف کی جاتی ہے۔ اس لئے یہ نافع بن عبدالرحمٰن بھی کہے جاتے ہیں اور نافع بن ابی نعیم بھی۔ حدیثیں تو یہ متعدد تابعین سے روایت کرتے ہیں۔ مگر قرأت میں یہ اصل شاگرد ہیں عبدالرحمٰن بن ہرمز کے۔ اس لئے عبدالرحمٰن بن ہرمز کو بھی پہچان لیجئے۔ یہ لنگ کھاتے تھے اس لئے اعرج مشہور ہیں۔ ابو داؤد ان کی کنیت تھی ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب الہاشمی کے غلام آزاد کردہ تھے۔ بعضوں نے محمد بن ربیعہ کا غلام لکھا ہے۔ ان کا مفصل ترجمہ تہذیب التہذیب ج۱۰ ص۴۰۷ سے ص۴۰۹ تک ہے۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ یہ کاتب المصاحف بھی تھے۔ قرآن مجید لکھا کرتے تھے۔ ۱۶۹ھ میں وفات پائی۔ ابو عمر الدانی جو مشہور امام قرأت ہیں ان کا قول تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے کہ انھیں سے نافع بن ابی نعیم نے قرآن کی قرأت زبانی سن کر حاصل کی تھی۔ عبدالرحمٰن بن ہرمز کے والد کا نام اسلام قبول کرنے کے بعد کیسان رکھا گیا تھا۔ اس لئے ان کو لوگ کہیں عبدالرحمٰن بن کیسان بھی کہتے ہیں۔ بعضوں نے ان کا سال وفات ۱۱۷ھ لکھا ہے۔ غرض یہ بھی موالی ہی میں سے تھے۔ یہ متعدد صحابہ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے متعدد محدثین حدیثیں لیتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی

ذکر نہیں کرتا کہ انھوں نے قرآن کس سے پڑھا تھا؟ اور نہ یہ کوئی لکھتا ہے کہ نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم کے سوا کیا اور بھی کسی نے ان سے قرآن پڑھا تھا؟ اگر اور بھی کسی نے ان سے قرآن پڑھا تھا تو وہ کون صاحب ہیں؟

ابوحمہ محمد بن یوسف جو تقریباً ایک مجہول الحال شخص ہیں وہ ابو قرہ موسیٰ بن طارق سے روایت کرتے ہیں کہ نافع بن ابی نعیم کہتے تھے کہ میں نے ستر تابعین سے قرآن کی قراۃ اخذ کی ہے۔ کاش ان ستر میں سے صرف سات کے نام ہی وہ بتا دیتے۔ اس لئے کہ ان کی قراۃ کی روایتیں جتنی ہیں تقریباً سب انھیں ابن ہرمز ایک غلام آزاد کردہ ہی سے ہیں۔ حدیثیں البتہ وہ اوروں سے روایت کرتے تھے۔ ابن حجر احادیث میں ان کے شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ولنافع عن الاعرج نفسه مائة حديث اخرى وعنه اخذ القراءة۔ اور نافع کے پاس (عبدالرحمٰن بن ہرمز) اعرج سے خاص اُن سے سو حدیثیں دوسری تھیں۔ (یعنی جو اور شیوخ سے ان کو نہ ملی تھیں) اور انھیں سے نافع نے قراۃ حاصل کی تھی۔ عنہ کے لفظ کا جملے سے پہلے آنا مفہوم حصر پیدا کرتا ہے۔ اس کو ادب عربی کے ابتدائی درجوں کے طلبہ بھی جانتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ نافع کو قراۃ کے اختلافات کی واقفیت صرف عبدالرحمٰن بن ہرمز اعرج ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اور نافع نے قرآن کی قراتوں کو صرف انھیں سے پڑھا تھا۔ دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۸۔ مگر اس حصر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اور کسی سے انھوں نے قراۃ کا فن حاصل ہی نہیں کیا۔ یہ حصر ان کے اُن شیوخ کے مقابلے میں ہے جن کا ذکر ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کے ترجمے میں پہلے کیا۔ جو صحابہؓ کی اولاد یا اکابر تابعین تھے جن سے صرف حدیثیں انھوں نے لی تھیں۔ وہ لوگ بے چارے اختلافات قراۃ سے کیا واقف جو اُن سے قراۃ کا فن سیکھتے۔ اس کے ماہرین تو صرف عجمی لوگ تھے جو عرب کے آزاد کردہ غلام تھے، جن کا اصل مرکز کوفہ تھا۔ مدینے کے قدیم باشندے جو عہد نبوی سے مدینے میں رہے۔ یا صحابہ کی اولاد میں سے جو مدینے ہی میں پیدا ہوئے۔ یا وہ موالی جو سچے مخلص مسلمان تھے اور جس خاندان سے متعلق ہوئے ان کے ہو کے رہے۔ ان غریبوں کو تو اختلافات قراۃ کا کچھ علم تھا ہی نہیں۔ اس لئے جن کا ذکر ابن حجر نے پہلے کیا ہے یہ حصر صرف اُنھی لوگوں کے مقابل ہے۔ ورنہ بعض دوسرے آزاد کردہ عجمی غلاموں سے بھی نافع نے قراۃ کا فن حاصل کیا تھا جیسا کہ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۱۱ صفحہ ۳۲۲ یزید بن رومان الاسدی ابو روح المدنی آل زبیر کے غلام آزاد کردہ کے ترجمے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ بن عباس بن ابی ربیعہ سے قرآن پڑھا تھا۔ اور ان سے نافع بن ابی نعیم نے قرآن کا علم حاصل کیا تھا۔ مگر یہ عبداللہ بن عباس بن ابی ربیعہ کون تھے؟ اس کا پتہ نہ ملا۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما تو ہو نہیں سکتے۔ اور ابن ابی ربیعہ کا پتہ کہیں نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ "ابن ربیعہ" کا لفظ غلط ہے غلطی سے اتنا اضافہ طباعت میں ہو گیا ہے۔ مراد حضرت عبداللہ بن عباس ہی ہیں۔ تو یقیناً ان سے صرف قرآن ہی یہ پڑھتے وہ تو حدیثوں کے بحر ذخار تھے جس طرح اوروں سے حدیثیں سنی تھیں اسی طرح ان سے حدیثوں کے سننے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا جاتا کہ وقرأ عليه القرآن یعنی اور ان سے قرآن بھی پڑھا تھا۔ جب ایسا نہیں ہے ان سے صرف قرآن ہی پڑھا تھا تو یقیناً یہ عبداللہ بن عباس بن ابی ربیعہ کوئی غیر معروف مجہول الحال شخص ہیں جن سے ائمہ رجال بالکل بے خبر ہیں اور موالی ہی قسم کے ہیں جو کوفیہ

کی طرف سے صرف اختلافات قرأت کے ایجنٹ تھے۔ کوفے کے مرکز سے نافع بن ابی نعیم کے پاس بھیجے گئے تھے۔ واللہ اعلم بہر حال نافع کے یہ استاد یزید بن رومان بھی آل زبیر کے غلام آزاد کردہ ہی تھے۔ اور انھوں نے خود بھی قرآن ایک مجہول الحال ہی شخص عباس بن ربیعہ کے بیٹے عبداللہ سے پڑھا تھا۔ اور ان سے صرف نافع صاحب نے قرآن کی قرأت کا علم حاصل کیا۔

مولانا مودودی کی علمی و تاریخی تحقیق

مولانا مودودی اپنے اس زیر تنقید مضمون شائع شدہ ترجمان القرآن جلد ۲۵ عدد ۳ کے صـ۱۷۷ میں نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں "متوفی سنہ ۱۶۹ھ پھر لکھتے ہیں کہ

"ان کا سب سے زیادہ معتبر سلسلۂ تلمذ یہ تھا کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا تھا" الخ

حضرت عبداللہ بن عباس کی وفات سنہ ۶۹ھ میں اور حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات سنہ ۵۷ھ میں ہوئی تھی۔ نافع اور حضرت ابن عباس کی وفات کے درمیان پورے سو برس کا فاصلہ اور نافع اور حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات کے درمیان ایک سو سے بھی دو برس فاضل کا فاصلہ تھا۔ نافع کی عمر اگر کوئی غیر معمولی لمبی ہوتی تو ائمہ رجال ضرور اس کو لکھ دیتے۔ جیسا کہ عموماً معمر راویانِ احادیث کی عمریں لکھ دیا کرتے ہیں۔ صحیح طور سے تعین نہیں کر سکتے جب بھی اتنا ضرور لکھ دیتے ہیں کہ انھوں نے سو سے زیادہ عمر پائی تھی یا اس کے نام کے ساتھ "معمر" کا لفظ لکھ دیتے ہیں جس طرح نافع ہی کے شاگرد کے شاگرد دسطوعی کو "معمر" لکھا ہے اور ان کی عمر ایک سو دو برس بتائی ہے۔ نافع صاحب کی عمر کم از کم سوا سو برس کی ہو جب کہیں یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ نافع نے ان دونوں بزرگوں سے قرآن مجید پڑھا۔ مگر نافع کی اتنی بڑی غیر معمولی عمر ثابت کرنا ناممکن ہے۔

لیکن آج مولانا مودودی ہی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ نافع بن عبدالرحمٰن نے حضرت عبداللہ بن عباس و حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے پورا قرآن پڑھا تھا۔ مولانا مودودی کے سوا کسی شخص نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا۔ ائمہ رجال اپنی کتابوں میں نافع کا ترجمہ لکھتے ہیں مگر کسی نے بھی تو نہیں لکھا ہے جو مولانا مودودی فرما رہے ہیں۔ تو کیا علمی و تاریخی تحقیق کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ کوئی بات جی سے گھڑ کر لکھ دی جائے؟ غرض یہ ثابت ہو گیا کہ مدینے میں نافع بن عبدالرحمٰن کوفیوں کے ایک ایجنٹ تھے جو چپ چاپ وہاں بٹھا دیئے گئے تھے کہ اکابر تابعین کے سامنے بیٹھ کر ان سے صرف حدیثیں سنا کرتے تھے۔ تاکہ ان کے آگے اپنا رسوخ قائم رہے۔ قرآن انھوں نے ان اکابر تابعین سے کبھی نہیں حاصل کیا۔ قرأت کے متعلق جو کچھ ذخیرہ ان کو ملا وہ اپنے جیسے آزاد کردہ غلاموں سے ملا یعنی اعرج (عبدالرحمٰن بن ہرمز) سے یا یزید بن رومان الاسدی سے۔ یہ خود بھی ایک آزاد کردہ غلام تھے اور ان کے دونوں استاد بھی آزاد کردہ غلام ہی تھے اور یہ تینوں عجمی الاصل تھے۔ اور اختلافاتِ قرأت کی سازشی انجمن کے ارکان اولی و خصوصی تھے۔ جو مدینے میں تو گمنام تھے مگر باہر ان کو مدینے کا قاری مشہور کیا گیا تھا۔ ورنہ مدینے میں جس کو قرآن پڑھنا تھا وہ صحابہؓ کی اولاد اور اکابر تابعین کو چھوڑ کر ان عجمی غلاموں سے قرآن کیوں پڑھتا؟ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ صحابہؓ کی اولاد اور یا اصاغر تابعین ہی میں سے جو عجمی الاصل نہ تھے! ان میں سے کتنے لوگوں نے نافع صاحب

اور ان کے دونوں استادوں سے قرآن پڑھا تھا؟ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

باقی رہا ابو محمدؒ یمانی کا ابو قرہ یمانی سے یہ روایت کرنا کہ ابو قرہ سے نافع بن عبدالرحمٰن نے کہا تھا کہ میں نے ستر تابعین کے سامنے قرآن پڑھا ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ ابو محمد محمد بن یوسف الیمانی صرف ابو قرہ موسیٰ بن طارق الیمانی ہی سے حدیثیں روایت کرتے ہیں، قاری نہ وہ ہیں نہ یہ۔ ابو قرہ نے نافع بن عبدالرحمٰن سے صرف کچھ حدیثیں نقل کی تھیں۔ ان سے ابو قرہ نے بھی قرآن نہیں پڑھا تھا۔ ورنہ ابن حجر تہذیب التہذیب ج۱۰ ص۳۷۳ میں ابو قرہ کا ترجمہ لکھتے ہوئے جہاں روی عن فلاں فلاں کے ساتھ "ونافع بن ابی نعیم" لکھا ہے وہاں اس کے بعد "وقرأ علیہ القرآن" بھی ضرور لکھتے۔ جس طرح نافع کے ترجمے میں روی عن فلاں فلاں کے ساتھ اعرج کا ذکر کیا ہے تو چند ہی سطروں کے بعد واخذ عنہ القرآن کہہ کر تصریح کر دی ہے۔ اس لئے کہ روی عن فلاں سے صرف روایت حدیث ہی سمجھی جائے گی۔ قرأت قرآن اس سے کوئی جاہل بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ نافع نے ایک یمنی کے سامنے تنہائی میں یہ دعویٰ کر دیا ہوگا کہ وہ تسلیم کرے گا۔ کسی مدنی کے سامنے بھی اگر ایسا کہتے تو معلوم ہوتا۔ یا کسی مجمع میں کہتے۔

اور ابن وہب کی بھی روایت کہ لیث بن سعد کہتے تھے کہ ادرکت اھل المدینۃ وھم یقولون قراءۃ نافع سُنّۃٌ یعنی لیث بن سعد کہتے تھے کہ "میں نے اہل مدینہ کو یہ کہتے ہوئے پایا کہ نافع کی قرأت سنت ہے" یعنی عہد نبویؐ سے اس وقت تک برابر سارے صحابہؓ و تابعینؒ اسی کے مطابق پڑھتے آئے۔ مگر اگر ایسا ہو تو بھی کہنا یہ تھا کہ نافع کی قرأت وہی ہے جو قرأت مسنونہ ہے کیونکہ نافع نے سو سے کچھ زیادہ بھی بالفرض عمر پائی ہو تو انھوں نے عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر اس وقت وہی قرأت پڑھی جاتی تھی جس کو نافع نے اختیار کیا تھا تو کیا اس وقت کے لوگ اس کو "نافع کی قرأت" ہی کہہ کر پڑھتے اور سمجھتے تھے؟ جو قرأت نافع کی پیدائش کے قبل سے جاری ہو اس کو نافع کی طرف منسوب کرنا تو اس قرأت کی توہین کرنا ہے۔ مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اس لئے کہ نافع کی پیدائش کے قبل کے لکھے ہوئے مصاحف اس وقت بھی موجود ہیں۔ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ یا اکابر تابعین کے مخطوطات۔ مگر ان میں سے ایک بھی نافع کی قرأت کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے یہ خلاف واقعہ بات ابن وہب (عبداللہ بن وہب المصری) نے لیث بن سعد المصری کی طرف منسوب کر کے کیوں کہی؟ اور اگر واقعی لیث ہی نے ایسی بات جو بالکل خلاف واقعہ تھی ابن وہب سے کہی تھی تو کیوں کہی تھی؟۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عبداللہ بن وہب بھی قریش کے موالی میں سے تھے اور لیث بن سعد بھی یہ دونوں قریش کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور نافع بھی غلام تھے اور نافع کے دونوں استاد بھی غلام تھے۔ اور یہ سب عجمی تھے۔ اور اختلاف قرأت کی تحریک عجمی غلاموں ہی کی چلائی ہوئی تھی۔ عبداللہ بن وہب کی پیدائش سنہ ۱۲۵ھ کی تھی اور وفات سنہ ۱۹۷ھ میں۔ اور لیث بن سعد کی پیدائش سنہ ۹۴ھ میں اور وفات سنہ ۱۷۵ھ میں۔ دونوں ہی اصفہانی الاصل تھے اور نافع بھی اصفہانی الاصل تھے۔ ابن وہب نے نافع کی قرأت کو رواج دینے کے لئے لیث کی طرف منسوب کر کے اس کی کوشش کی کہ مصر میں نافع کی قرأت جاری ہو۔ اور مصر والے جو قرأت متواترہ مسنونہ پڑھ رہے ہیں اس کو حفص بن سلیمان الکوفی کی قرأت سمجھ کر چھوڑ دیں۔ مگر قرآن کی حفاظت کا وعدہ الٰہی ایسا نہیں ہے کہ قرآن کے کسی ایک نقطے یا اعراب کو بھی ادھر سے اُدھر ہونے دے۔ اس لئے باوجود اتنے پروپیگنڈے اتنی جدوجہد اور

ایسی گہری سازش کے بھی نہ مصر میں نافع کی قرأت چل سکی نہ مدینے میں اور نہ دنیا کے کسی حصے میں۔ واللہ یحق الحق بکلمتہ وھو غالب علی امرہ ولا یعجزہ احد فی السمٰوٰت والارض۔

اسی طرح بعض اکابر امت کی طرف جو نافع کی قرأت کی تعریف منسوب کی گئی ہے وہ یقیناً غلط منسوب ہے اور کسی کی طرف اگر نسبت صحیح کی گئی ہے تو اس کا قائل ضرور اسی عجمی طبقے کا ہوگا۔ البتہ متاخرین چونکہ فریب خوردۂ عجم تھے اور وہ اختلاف قرأت کے دام تزویر میں پھنس چکے تھے اس لئے متاخرین جو کچھ بھی اختلافِ قرأت یا کسی خاص قاری کی تعریف کریں۔ وہ قابلِ اعتبار و استناد نہیں۔

نافع بن عبدالرحمٰن کے تلامذہ، جن کے ذریعے وہ قرأتیں بعد والوں کو ملی ہیں جو نافع کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ صرف دو ہی ہیں جیسے ان کے استاد قرآن صرف دو تھے۔ باوجود اس کے کہ حدیثوں کے شیوخ خود نافع کے بھی دس بارہ سے زیادہ ہی ہیں اور ان کے ان دونوں تلامذہ کے شیوخ بھی نافع کے سوا بہت ہیں جن سے وہ دونوں حدیثیں روایت کرتے تھے۔ غرض قرآن اور اس کی قرأتوں کی روایت کرنے والے صرف دو ہی آدمی ان کو ملے۔ کیونکہ جب تک سازش کی رازداری اور من مانی خود ساختہ قرأتوں کی رازدارانہ اشاعت کی پوری ذمہ داری لینے والوں کو وہ اپنا شریک کار بنا سکتے تھے۔ ایک تو عیسیٰ بن مینا رحمٰن کا لقب قالون ہے۔ تہذیب التہذیب جو صحاح کے راویوں کی کتاب ہے اس میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ لسان المیزان جو خاص کر کے ضعیف و مجروح راویوں کی کتاب ہے اس میں ابن حجر نے ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو نہیں مگر ان کے والد مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ احمد بن صالح المصری سے کسی نے پوچھا کہ ان کی حدیثیں کیسی ہیں؟ تو وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ تم ہر کس و ناکس سے حدیث لے لیا کرتے ہو۔ مگر چونکہ بخاری میں ان کی حدیث موجود ہے اس لئے ان کے متعلق اس سے زیادہ ابن حجر نہیں لکھ سکے بلکہ توثیق کی کوشش کی ہے۔

دوسرے راوی قرأت جو نافع کے ملے وہ ورش کے لقب سے مشہور ہیں جن کا ذکر ابن حجر نے کہیں نہیں کیا۔ ان کا پورا نام ابو سعید عثمان بن سعید ہے۔ یہ قبطی تھے مگر قریشیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اس لئے قرشی کہے جاتے ہیں۔ ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔

تو نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم صاحب جو مدینے کے امام القراء قرار دیئے گئے ہیں۔ دونوں غلام۔ یہ خود غلام۔ ان کے دونوں شاگرد غلام۔ اور اس وقت کے اکابر بلکہ اصاغر مدینہ میں سے بھی کسی ایک شخص نے کبھی ان سے قرأت حاصل نہیں کی۔ یہ صرف ٹینے میں بیٹھے رہتے تھے اور کونے والے ان کا پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ یہ مدینے کے قاری ہیں۔ بلکہ یہ پروپیگنڈہ ان کی وفات کے بعد سے شروع ہوا۔ اور ان کو مدینے کا قاری اور امام القراء ان کے مرنے کے بعد مشہور کیا گیا۔ اور وہ بھی سو ڈیڑھ سو برس کے بعد۔ بلکہ کچھ اور مدت کے بعد۔ نافع بے چارے تو مدینے کے معمولی لوگوں میں سے تھے۔ ان کی کوئی اہمیت وہاں نہ تھی۔ ورنہ مدینے میں کتنے تاریخی واقعات ہوئے ان کا یا ان کے والد ماجد کا کسی موقع پر بھی کوئی ذکر تاریخی کتابوں میں ضرور آتا۔ نافع غریب کی وفات کے کم سے کم سو برس کے بعد ان کے سر پر مدینے کے امام القراء ہونے کی پگڑی باندھی گئی ہے۔ اور قالون اور ورش جیسے گمناموں کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ اور غالباً یہ دونوں بھی اپنے مرنے کے بعد ہی نافع کے جانشین بنے ہوں گے۔ اس لئے کہ اختلافِ قرأت کا بازار لگایا گیا ہے وہ چوتھی صدی کے اواخر میں۔ اس سے پہلے بازار نہیں لگایا گیا تھا کونے میں بیٹھے یاران طریقت بازار کا نقشہ بنا رہے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعود

پر جو یہ تہمت رکھی گئی تھی کہ جب حضرت عثمانؓ کا بھیجا ہوا قرآن کوفے میں پہنچا تو انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس کے قبول کرنے سے منع کیا اور اختلافات کو باقی رکھنے کی تاکید کی۔ اس لئے مختلف مصاحف مصحف عبداللہ بن مسعودؓ مصحف ابی بن کعب مصحف سعد بن ابی وقاص وغیرہ سب کوفے ہی میں ان لوگوں کے نام سے بنا لئے گئے تھے۔ ابن جریر طبری کی وفات سنہ ۳۱۰ھ میں ہوئی اور ان کی زندگی تک اختلافِ قرأت کا وجود نہ تھا۔ اس وقت عجمیوں اور موالی قسم کے لوگوں نے صرف انزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف کا ڈھول پیٹنا کافی سمجھا تھا اور چھ قرأتوں کے غائب ہوجانے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ حضرت عثمانؓ نے امت کو قرآن میں اختلاف سے بچانے کے لئے چھ قرأتوں کو ترک کرادیا تھا اور ضائع کرادیا اور صرف ایک قریش کی قرأت کو باقی رکھا۔ اس لئے حضرت عثمانؓ کے حکم سے چھ قرأتیں مٹا دی گئیں اور ایک ہی قرأت باقی رہی تو اب ان چھ قرأتوں کو تلاش کرنا غلط ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں[1]

"اگر کوئی پوچھے کہ تم کس کتاب اللہ میں ایسے حروفِ واحدہ ومفردہ پاؤ گے جو سات مختلف لغات سے پڑھے جاتے ہوں مگر معنی میں متفق ہوں تو ہم تمہارے اس سوال کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ہم نے یہ دعویٰ کب کیا کہ وہ آج موجود ہیں۔ ہمیں تو صرف خبر دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا انزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف اس کے معنی کیا کیا ہیں جو اخبار میں وارد ہیں۔ جس کا ذکر ہم[2] نے پہلے کیا۔ نہ وہ جو ہمارے مخالفین[3] اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان حروف کی بنا پر جس کو ہم نے پہلے بیان کیا تو اگر کہا جائے کہ پھر وہ چھ حروف جو اترے تھے انکی علامت موجودگی میں ان کا کیا حال ہوگا۔ تم نے خود ان کی حدیثیں پیش کیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود پڑھا تھا اپنے صحابہ کو پڑھایا تھا۔ ان کو ان قرأتوں کے مطابق پڑھنے کا حکم فرمایا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے ان سب قرأتوں کو اپنے نبی پر اتارا تھا۔ کیا وہ چھ قرأتیں منسوخ ہوگئیں یا اٹھ گئیں۔ تو ان کے منسوخ

---

[1] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو ایک قرأت مخصوصہ ابن جریر کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ابن جریر کی طرف ان کی وفات کے بعد بنا کر منسوب کی گئی ہے۔ ابن جریر خود اس کے ذمہ دار نہیں۔ ۱۲ تمنا۔

[2] ابن جریر نے اس مقدمہ تفسیر میں اکاون طریق سے اس حدیث موضوع انزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف کی روایت اور اس کے معانی بھی اسی ضمن میں جو مروی ہیں لکھے ہیں میں نے ان کی بھی تنقید کی ہے۔ مگر طوالت کے خوف سے اس کو اعجاز القرآن کی دوسری جلد کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ ۱۲ تمنا

[3] ابن جریر کے مخالفین کون لوگ تھے جن کے نزدیک اختلافات موجود تھے۔ یہ وہی کوفے والے تھے جن سے ابن جریر کو اتفاق نہ تھا ورنہ اور کون ہو سکتا ہے جن کو ابن جریر اختلاف قرأت کے متعلق اپنا مخالف کہیں۔ ابن جریر کے نزدیک سبعۃ احرف میں سے چھ حروف باقی نہ رہے اور مخالفین کے نزدیک وہ سب باقی ہیں۔ ابن جریر نے انہیں کی تردید کی ہے اور وجوہات تردید اس سے پہلے بیان کی گئی ہیں۔ ۱۲ تمنا۔ [4] معلوم ہوتا ہے کہ کوفے کے یہ ملاحدہ عجم ابن جریر کے پاس پہونچے تھے یہ سمجھ کر کہ یہ بھی عجمی ہیں اور شیعہ بھی ہیں یہ ضرور ہمارے ساتھ ہو جائینگے مختلف مصاحف انھوں نے تیار کر رکھے تھے وہ دکھائے تھے یا ان کا ذکر کیا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کے منع کرنے کا بھی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے مصحف عثمانی کی اتباع کرنے سے منع کیا اور ہم لوگوں کو اپنے اپنے مصحف پر قائم رہنے کی تاکید کی مگر ابن جریر نہ شیعہ تھے نہ عجمی ہی مگر حالی ہی سمجھتے اور نہ ان ملاحدہ کی طرح جاہل تھے۔ اس لئے ان کے دام میں نہ آئے۔ ابن جریر نے ان کو اپنا یعنی مسلمانوں کا مخالف قرار دیکر ان کا ذکر کیا۔ ۱۲۔ تمنا عفوله

یا مرفوع ہو جانے کی کیا دلیل ہے ؟ یا امت ان کو بھول گئی۔ اگر ایسا ہے تو ایک مامور بہ چیز کا ضائع کر دینا ہے۔ جس کی حفاظت کا حکم تھا آخر اس مسئلے میں کون سا قول فیصل سمجھا جائے ؟

تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ وہ نہ چھ قرائتیں منسوخ ہوئیں نہ مرفوع ہوئیں اور نہ امت ان کو بھولی۔ باوجود اس کے کہ وہ ان کے حفظ پر مامور تھی۔ اصل یہ ہے کہ امت حفظ قرآن پر مامور تھی اور اس کو یہ آزادی دی گئی تھی کہ ان سات قرأتوں میں سے جس قرأت پر بھی چاہے پڑھے، حفظ کرے۔ جس طرح کوئی شخص قسم کھا کر توڑ دے تو اس کو یہ اختیار ہے کہ تین کفاروں میں سے جس کفارے کو چاہے ادا کرے۔ چاہے غلام آزاد کرے چاہے دس مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا کپڑے پہنا دے۔ تو ان تین کفاروں میں سے جس کفارے کو بھی وہ ادا کر دے گا۔ اللہ کے حق سے اس بارے میں سبکدوش ہو جائے گا۔ اسی طرح امت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ان سات حرفوں میں سے جس حرف پر بھی چاہے قرآن کو پڑھے اور یاد کرے۔ امت پر واجب تھا کہ سات حرفوں میں سے کسی ایک حرف پر بھی ثبات رکھے تو جب ایک حرف کے مطابق امت پڑھنے لگی تو باقی حروف خود بخود ترک ہو گئے۔ تو اگر پوچھا جائے کہ وہ کون سا باعث تھا کہ امت ایک حرف پر ثابت ہو گئی اور دوسرے چھ حروف ساری امت سے بالکل ترک ہو گئے ؟ تو اس کی وجہ یہ ہے۔"

(اس کے بعد ابن جریر نے جمع قرآن بعہد صدیقیؓ کی روایت اور پھر نقل مصاحف بعہد عثمانیؓ کی روایت نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے بتقاضائے مصلحت صحابہ کے مشورے سے اختلافات فی القرآن کی کثرت دیکھی تو صرف لغت قریش پر قرآن کو باقی رکھا اور باقی حروف کی چھ قرأتوں سے امت کو روک دیا۔ اور ایسے مصاحف کو جو دوسری قرأتوں کے مطابق لکھے ہوئے تھے ضائع کرا دیا۔ اس لئے چھ قرأتیں دنیا سے ناپید ہو گئیں اور ہر جگہ صرف ایک ہی قرأت کا مصحف ہی ملتا ہے۔

ابن جریر کی اس تصریح سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے وقت تک اختلافات قرأت کے سات اسکول نہیں قائم ہوئے تھے اور قرأتوں کا بازار نہیں لگا تھا۔ صرف کوفے کے متعدد گھروں میں چپکے چپکے قرأت کی کھچڑی پک رہی تھی۔ اور دسترخوان پر صرف مولی قسم کے ایسے لوگ جو ان کے دام میں آ چکے تھے یا آ جا سکتے تھے وہی بٹھائے جاتے تھے۔ مگر اسکول کا نقشہ کاغذ پر ضرور بن گیا تھا۔ اور اپنا ایک آدمی ہر اسکول میں رکھ دیا گیا تھا۔ مگر جہاں وہ اسکول بنا تھا۔ اس کے لوگ مدت تک اس اسکول سے کچھ واقف نہ ہوتے اور جو ہیڈ ماسٹر اسکول کا ہوتا وہ ایک طالب العلم کی طرح وہاں کے محدثین کے پاس جا کر صرف حدیثیں سنا کرتا تھا۔ اس کا اسکول کوفے کے دار الندوہ میں ایک کاغذ پر ہوتا تھا۔ یہاں کچھ دنوں رہ کر ہر ہیڈ ماسٹر کو چپکے چپکے دار ندوۃ الہند اسکول چلانے کا طریقہ معلوم کر لینا پڑتا تھا۔

مختصر یہ کہ نافع صاحب کو ہم راز صرف دو شاگرد اختلاف قرأت کے ملے ایک تو قالون عیسیٰ بن مینا جو بالکل نرپٹ بہرے تھے پڑھنے والوں کے لبوں کی حرکت سے تلفظ کا اندازہ لگا کر تعلیم دیتے تھے۔ جیسا کہ ابن حجر نے لکھا ہے۔ دوسرے ورش ابو سعید عثمان بن سعید۔ قالون کے بھی دو شاگرد قرار دیئے گئے۔ ابو نشیط اور حلوانی۔ اسی طرح ورش کے بھی دو شاگرد ازرق اور اصبہانی۔ پھر ابو نشیط کا ایک شاگرد ابو بکر اس کے دو شاگرد ابن بویان اور قزاز اور حلوانی کے دو شاگرد ابن مہران اور جعفر بن محمد اور ازرق کے دو شاگرد اسمٰعیل النحاس اور ابن سیف اور اصبہانی کے بھی دو شاگرد ابن جعفر اور مطوعی۔ تو خیال فرمایئے سو تین دن پہلے سے پہلے تین دن پہل کے بعد

تین سہل، تین ترین ہیں۔ یہ سب کے دن ہوئے؟ نافع کے دو استاد پھر نافع کے دو شاگرد جنھیں تو آپ ایک حد تک جان گئے۔ اب ہر شاگرد کے دو شاگرد اور پھر ہر شاگرد کے شاگرد کے دو شاگرد۔ ان اٹھارہ آدمیوں کے حالات پر بحث آسان نہیں۔ خصوصاً جب ان میں سے بیشتر مجہول الحال ہیں۔ دنیائے رجال میں جن کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں ذکر ہے وہاں اس سلسلۂ اسناد کے خلاف مذکور ہے۔ مثلاً حلوانی کو یہاں قالون کا شاگرد بتایا ہے مگر لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۲۲۲ میں ان کے استادِ قرأت کا کہیں ذکر نہیں۔ ان کے صرف ایک شاگرد قرأت کا ذکر ہے وہ ان دو میں سے کوئی بھی نہیں جن کو اس سلسلے میں ان کا شاگرد بنایا گیا ہے بلکہ ایک تیسرے شخص ابو الکرم شہرزوری کو لکھا ہے۔ ان کا سال وفات سنہ ۵۰۵ھ ہے۔ اسی طرح اصبہانی کو ورش کا شاگرد بتایا ہے مگر لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۲۷ میں ان کو کسائی کا شاگرد لکھا ہے۔ ورش کا ذکر تک نہیں۔ اسی طرح مطوعی حسن بن سعید بن جعفر المعتمر ایک سو دو برس کی عمر پائی تھی۔ انھوں نے ابن مجاہد اور اسحٰق بن احمد الخزاعی سے قرآن پڑھا تھا۔ کسی اصبہانی کا شاگرد ان کو نہیں لکھا ہے۔ یہ لوگ بغیر ناموں کی تصریح کے قصداً حقیقتِ حال کو چھپانے کے لئے صرف کنیت یا لقب وغیرہ لکھ کر اشخاص کو نقاب پوش بنا دیتے ہیں تاکہ ان کی شخصیت معلوم نہ ہو۔ انشاء اللہ آئندہ ان اشخاص پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر سرِ دست نافع، ان کے دونوں شیخ اور ان کے دونوں شاگردوں کا حال ہی حقیقتِ حال کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

ع قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا۔

عبداللہ ابنِ کثیر قاری مکہ

عبداللہ بن کثیر الداری المکی ابو سعید القاری مولیٰ عمرو بن علقمۃ الکنانی۔ مکہ مکرمہ میں یہ عطر فروشی کرتے تھے۔ اہل مکہ عطر فروش کو داری کہتے تھے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ نہیں۔ بلکہ وہ بنی تمیم کی ایک شاخ دار بن ہانی کی اولاد میں سے تھے اس لئے ان کو الداری کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال یہ علقمۃ الکنانی کے بیٹے عمرو کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابو الزبیر المکی سے حدیث روایت کرتے تھے اور مجاہد بن جبیر سے بھی اور انھیں سے قرآن بھی پڑھا تھا۔ اور ابو المنہال عبدالرحمٰن بن مطعم سے اور عکرمہ حضرت ابن عباس کے آزاد کردہ غلام سے بھی حدیثیں روایت کرتے تھے۔

صرف ابو عمرو الدانی نے کہا ہے کہ انھوں نے قرأت حاصل کی تھی عبداللہ بن السائب المخزومی سے۔ مگر مشہور تر ہے کہ انھوں نے مجاہد بن جبیر سے قرأت سیکھی تھی۔ امام بخاری نے بھی یہی لکھا ہے کہ عبداللہ بن کثیر المکی نے قرأت مجاہد سے حاصل کی تھی۔

ایک صاحب عبداللہ بن کثیر بن المطلب بن وداعۃ السہمی بھی تھے اور دونوں ہمعصر تھے مگر یہ بھی فقط محدث تھے۔ اور داری مکہ مکرمہ کے قاری مقرر کئے گئے تھے۔ ائمہ رجال نے دونوں کے بعض حالات میں خلط ملط کر دیا ہے۔ ابن ابی مریم ابن معین کا قول روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن کثیر الداری القاری ثقۃٌ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ عجمی الاصل ملک فارس کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ غرض صرف ابو عمرو الدانی نے بقول ابن حجر ان کو عبداللہ بن السائب المخزومی کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ ابو عمرو الدانی متوفی سنہ ۴۴۴ھ کے سوا اور کوئی بھی متقدمین میں سے ان کو مجاہد کے سوا اور کسی دوسرے کا شاگرد قرأت میں نہیں بتاتا۔ بلکہ تیسیر میں

ابو عمرو الدانی نے حضرت ابن عباس کے ایک آزاد کردہ غلام مرداس کو بھی ان کا استاد قرات بتلایا ہے۔ لیکن "مرداس" نام کا کوئی شخص جو حضرت ابن عباس کا غلام آزاد کردہ ہو دنیائے رجال میں کہیں نظر نہیں آتا بالفرض اگر ہو اور کسی گوشۂ گمنامی میں پڑا خراٹے لے رہا ہو تو وہ بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی ٹھہرا۔ اور جو ایسا مجہول الحال ہو جس کا نام تک ائمہ رجال کی زبان پر نہیں آتا اس کا ذکر کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ مجاہد سائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ تھے۔ اس لئے مجاہد نے اپنے آقا سائب کے صاحبزادے عبداللہ سے قرآن پڑھ لیا ہو۔ یہ ممکن ہے۔ سائب اور عبداللہ بن سائب دونوں باپ بیٹے صحابی تھے۔ عبداللہ بن السائب کی وفات ۶۵ھ میں ہوئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی۔ عبداللہ بن کثیر عبداللہ بن سائب کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے۔ اس لئے ابن کثیر کا ابن سائبؓ سے قرآن پڑھنا اور قرات حاصل کرنا صحیح نہیں۔ ابن کثیر نے صرف اور صرف مجاہد بن جبیر سے قرات کا فن حاصل کیا جیسا کہ امام بخاری اور سارے ائمہ رجال لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الدانی جو ابن کثیر سے دو سو برس سے زیادہ بعد کے آدمی ہیں ابن کثیر کے اساتذہ کے حال سے اتنا واقف نہیں ہو سکتے جتنا امام بخاری اور دوسرے ان سے متقدم ائمہ رجال واقف ہو سکتے ہیں۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب "تیسیر" ابو عمرو الدانی کی تصنیف ہے ہی نہیں۔ بلکہ یارانِ طریقت نے ایک کتاب تصنیف کر کے ان کے نام سے ان کی وفات کے بعد منسوب کر کے اس کی متعدد نقلیں کر کے پھیلائی گئی ہیں جس کا پتہ خود کتاب "تیسیر" کی ورق گردانی سے بآسانی مل سکتا ہے۔ بیسیوں جگہ آپ قال ابو عمرو اور قال ابو عمرو الدانی کے الفاظ دیکھیں گے اگر اس کتاب کے مصنف خود ابو عمرو الدانی ہوتے تو وہ خود اپنے متعلق قال ابو عمرو الدانی کیوں لکھتے؟ ہاں اگر دو شخصوں کے مکالمہ کا ذکر ہوتا اس طرح کہ قال فلاں وقال ابو عمرو" تو ممکن تھا کہ مصنف نے خود اپنا قول اپنے نام کی طرف منسوب کر کے لکھا ہو۔ مگر یہاں تو مکالمہ مناظرہ کی صورت کہیں بھی نہیں۔ مسائل کتاب لکھنے میں قال ابو عمرو لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب یہ قال ابو عمرو الدانی لکھنے والے کون صاحب ہیں جب تک ان کا صحیح نام و نشان نہ ملے اس وقت تک ان اقوال کی نسبت جو ابو عمرو الدانی کی طرف کی گئی اس کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ مگر بہرحال ایسی کتاب قابلِ وثوق تو نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن کثیر کے اساتذہ قرات میں خلافِ جمہور ائمہ رجال حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ کا نام اس میں لکھ دیا گیا۔ اور ایک گمنام اور اسم بامسمّٰی "مرداس" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام آزاد کردہ کا نام بھی تعدد شیوخ ثابت کرنے کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ بہرحال ابو عمرو الدانی بھی قرطبی تھے اور خاندانِ بنی امیہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اتنا یاد رکھئے کہ متقدمین ائمہ قرات میں آپ تقریباً ۹۵ فیصدی موالی یعنی آزاد کردہ غلاموں ہی کو پائیں گے۔ اختلافِ قرات کا فتنہ ان عجمی غلاموں ہی کا پیدا کردہ تھا۔ اور انہوں نے ایک زبردست سازش کے ماتحت یہ تحریک چلائی تھی۔

کتاب "تیسیر" اور اس کے مصنف ابو عمرو الدانی کا ذکر تو ضمناً آ گیا۔ اب آپ عبداللہ بن کثیر کے اصل استاد مجاہد بن جبیر کا حال سنئے کہ مکہ مکرمہ کے مرکزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر یہی مجاہد بن جبیر ہی تھے۔ عبداللہ بن کثیر تو ان کے ایک شاگرد تھے جن کے سر پر قرات کی پگڑی باندھ دی گئی۔

مجاہد بن جبیر یہ سائب بن ابی سائب رضی اللہ عنہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ان کی پیدائش ۲۱ھ میں زمانہ خلافت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہوئی تھی۔ ۸۳ سال کی عمر میں ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔ تفسیر کے بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ کہتے تھے کہ حضرت ابن عباس کے سامنے تیس بار قرآن پڑھا۔ اعمش کوفی جو شیعہ بھی تھے اور ان کے شاگرد رشید بھی کہتے تھے کہ مجاہد کہتے تھے کہ "اگر ہم عبداللہ بن مسعود کی قرات کے مطابق قرآن پڑھتے تو ہمیں اس کی حاجت نہ پڑتی کہ اکثر جگہ ابن عباس سے معنی مطلب پوچھ لیتے"۔

اگر اعمش کی یہ روایت صحیح ہے اور واقعی مجاہد نے ایسا کہا ہے تو تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مجاہد نے اپنے کوفی اساتذہ و تلامذہ سے عبداللہ بن مسعود والا مصحف کیوں نہیں مانگ لیا تھا؟ ترمذی جلد دوم ص ۱۳۸ مطبوعہ مجتبائی دہلی میں نقل مصاحف بعہد حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ والی روایت[1] جو بخاری میں امام زہری سے ہی مروی ہے۔ یہاں بھی انہی زہری سے روایت کی گئی ہے مگر متعدد مضامین کے اضافے کے ساتھ جن سے بے چارے امام بخاری کو بے خبری رکھنا مناسب سمجھا گیا تھا۔ بہرحال ترمذی میں یہ موجود ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے عراقی تلامذہ کو منع کر دیا تھا کہ اپنے مصاحف کو مصحف عثمانی کے مطابق کر کے ضائع نہ کرو۔ بلکہ اپنے حال پر باقی رکھو۔ اور مصحف عثمانی کی طرف داروں سے اپنے مصاحف کو چھپائے رکھو۔ محفوظ رکھو کہ کہیں وہ چھپ کر ضائع نہ کریں۔ اس لئے عبداللہ بن مسعودؓ کے سینکڑوں تلامذہ جو عراق میں تھے سب کے پاس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف ضرور موجود ہوگا۔ کوفہ تو عراق کا مرکز فتنہ و فساد تھا۔ اور اسی تلقین و تاکید ابن مسعودؓ کا حیلہ قائم کر کے تو کوفے ہی سے اختلاف

---

[1] نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایت امام بخاری موسیٰ بن اسمٰعیل سے وہ ابراہیم بن سعد سے، اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں۔ اور ترمذی محمد بن بشار سے وہ عبدالرحمن بن مہدی سے وہ ابراہیم بن سعد سے اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں۔ مگر ابراہیم بن سعد موسیٰ بن اسمٰعیل سے وہ سب باتیں نہیں کہتے جو باتیں وہ عبدالرحمن بن مہدی سے کہتے ہیں۔ شاید اس لئے موسیٰ بن اسمٰعیل سے نہ کہا کہ وہ منقریوں کے غلام آزاد کردہ تھے اور بعض لوگوں نے ان کے متعلق کچھ کلام بھی کیا ہے یا زہری نے ان سے بھی کہا ہو مگر ان کی ہمت نہ پڑی کہ امام بخاری سے یہ سب لغو باتیں کہہ دیں۔ بہرحال ترمذی کی روایت میں اصل روایت کے ادپر تابوت اور تابوہ کا اختلاف بھی زید بن ثابت سے مروی ہے اور پھر عبداللہ بن مسعودؓ کی خفگی کا ذکر بھی ہے کہ انھوں نے اہل کوفہ کو پکار کر کہا کہ اے لوگو! اور اللہ کو یہ چھوکرا زید بن ثابت جب میں ایمان لایا تھا اس وقت یہ اپنے کافر باپ کی پیٹھ میں تھا۔ یہ تو جمع یا کتابت قرآن کے لئے بلایا جائے اور مجھ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کے بعد ترمذی کی روایت کی عبارت ہے۔ ولذ الک قال عبداللہ بن مسعود۔ اور اسی غصے کی وجہ سے کہ جمع و نقل مصاحف کے وقت ان کو نظر انداز کیوں کیا گیا عبداللہ بن مسعودؓ نے پکار کر کہا کہ اے اہل عراق! اکتموا المصاحف التی عندکم تم اپنے مصاحف کو چھپائے رکھو دغلوھا اور اس کے ساتھ خیانت کرو۔ یعنی حضرت عثمانؓ جب اپنا مصحف بھیجیں کہ اپنے اپنے مصاحف کو اس کے مطابق بنالو اور جو مصحف میں اس سے اختلاف ہو اس کو دھو ڈالو یا جلا ڈالو تو تم لوگ اس حکم کو نہ مانو۔ اپنے اپنے مصاحف کو ان کے عمال سے چھپائے رکھو اور امیر المومنین کے حکم کی نافرمانی کرو اور اس طرح قرآن کے ساتھ خیانت کرو۔ اس کے بعد عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ قرآن میں ہے کہ جو شخص خیانت کرے گا تو جس چیز کی خیانت کی ہے اس کو لے کر قیامت کے دن (باقی اگلے صفحہ پر)

قرأت کا طوفان امڈا۔ مجاہد بن جبیر کے کوفی اساتذہ میں سے عبداللہ بن سجرہ الازدی الکوفی۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ الکوفی، اور پھر خود عبداللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادے ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن مسعود الکوفی وغیرہم جن میں سے ہر ایک حضرت عبداللہ بن مسعود کا خاص شاگرد تھا۔ سب سے نہیں تو ان کے صاحبزادے عامر سے تو ان کو عبداللہ بن مسعود کا مصحف مل سکتا تھا۔ پھر ان کے خاص عقیدت کیش شاگردوں میں تو زے فیصدی کوفی ہی تھے۔ عطا ابن السائب الکوفی، فطر بن خلیفۃ الکوفی۔ حکم بن عتیبہ الکوفی، زبید الیامی الکوفی۔ سلمہ بن کہیل الکوفی۔ سلیمان الاعمش الکوفی۔ منصور بن المعتمر الکوفی۔ مسلم بن عمران البطین الکوفی۔ بکیر بن الاخنس الکوفی۔ حبیب بن ثابت مولیٰ بنی اسد الکوفی۔ حسن بن عمرو الفقیمی الکوفی۔ ابوجعفر عثمان بن مغیرۃ الکوفی اور عمرو بن ذر الکوفی وغیرہم۔ اتنے کوفیوں کے جھرمٹ میں رہنے والا مجاہد بن جبیر اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کے لئے ترستا رہے؟ ان میں سے تو ہر ایک کے پاس عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف موجود ہوگا۔ اگر یہ کسی سے بھی مانگتے تو متعدد نسخے اس مصحف کے ان کے پاس موجود ہو جاتے۔ مانگنے کی بھی ضرورت نہ تھی صرف جو اعمش سے کہا تھا وہی کسی اور کوفی سے کہتے۔ خود ان کو گوہر مقصود مل جاتا۔ اعمش چونکہ شیعہ تھے اس لئے انھوں نے ایک سُنّی سے اغماض کیا۔ ورنہ ان کے پاس بھی ضرور ہوگا۔

حقیقت حال نہ ترمذی کی وہ روایت صحیح ہے کہ صرف اس غصے پر کہ ان کو جمع قرآن یا نقل مصاحف کے وقت کیوں نہ پوچھا گیا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے امیر المومنین کے حکم ہی کو نہیں بلکہ سارے صحابہؓ کے خلاف اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ذرا الگ بنا کر قرآن مجید میں اختلافات کو قائم رکھنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا سامان مہیا کر دیا۔ اور اس غصے میں اپنے ساتھ اپنے شاگردوں کو بھی گمراہ کیا؟ نعوذ باللہ من ذالک۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شان اس قسم کی کینہ پروری اور بغض و عناد سے بہت پاک و بالاتر تھی۔ یہ ساری باتیں ان پر بہتان ہیں۔ بلکہ جمع قرآن بعہد صدیقیؓ و نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایتیں ہی سرے سے موضوع اور منافقین عجم کی سازشوں کے ماتحت گھڑی گئیں۔ اور صحیح بخاری و ترمذی و نسائی و مسند احمد وغیرہ میں داخل کر دی گئیں۔ خود امام بخاری و امام ابوعیسیٰ الترمذی و امام نسائی و امام احمد بن حنبل کا دامن تقدس ان روایتوں کی آلودگیوں سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں یقیناً پاک ہے۔ اور عجب کیا ہے کہ مجاہد نے بھی ایسا نہ کہا ہو۔ یہ سلیمان الاعمش شیعہ کوفی نے غریب مجاہد پر بہتان باندھا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال اتنی تصریح سے یہ فائدہ ہوا کہ اہل مکہ کے لئے جو قرأت کا اسکول بنایا گیا تھا اور اس کا ہیڈ ماسٹر مجاہد بن جبیر کو بنایا گیا تھا اس کا پتہ چل گیا کہ وہ کوفیوں کا ہی ساختہ پرداختہ تھا۔ مجاہد کے اصل استاد جو طریق کار سکھلاتے تھے وہ بھی کوفی ہی تھے، اور ان کے شاگردانِ رشید بھی تقریباً سب کے سب کوفی ہی تھے۔ مجاہد مکے میں رہتے تھے مگر ان سے قرأت کا فن کوفیوں کی جماعت سیکھتی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوگا۔ تم لوگ اپنے اپنے مصاحف کے ساتھ اللہ کے قیامت کے دن ملو۔ اس روایت سے یہ معلوم ہو گیا کہ کوفہ و عراق میں عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ کے پاس وہ سب قرآن عبداللہ بن مسعودؓ والا، ابی بن کعب والا اور جو کچھ بھی تھا سب موجود تھا۔ اور سب موجود رہا۔ ۱۲ تمنا غفرلہٗ

اہل مکہ میں جو لوگ صحابہ کرام کی اولاد میں تھے یا اکابر تابعین تھے ان کو کون سی ایسی ضرورت پڑی تھی کہ ایک غلام آزاد کردہ سے وہ قرأت سیکھتے۔ اسی لئے آپ اہل مکہ میں ان کے تلامذہ ڈھونڈھیں گے تو ان میں بھی زیادہ تر موالی (آزاد کردہ غلام) یا کچھ دیہاتی عوام ہی کو پائیں گے۔ جیسے ابو الزبیر محمد بن مسلم المکی جو بنی اسد کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور کوفے میں بنی اسد کا ایک مستقل محلہ تھا جس میں اکثریت شیعوں ہی کی تھی اور یہی محلہ وہاں سبائیوں کی سازش گاہ تھا۔ اور عبید اللہ بن ابی یزید المکی جو آل قارض بن شیبہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور سیف بن سلیمان جو مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور عبداللہ بن کثیر الداری القاری جو مجاہد کے خاص شاگرد اور قرأتی اسکول کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کہئے مجاہد کے ساتھ بنے۔ اور مجاہد کے بعد قرأت کی پگڑی انھیں کے سر پر باندھ کر اسی اسکول کا مستقل ہیڈ ماسٹر انھیں کو بنا دیا گیا۔ یہ بھی عمر بن علقمۃ الکنانی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس تفصیل سے آپ عبداللہ بن کثیر قاری مکہ سے تو پوری طرح واقف ہو گئے۔ اب ان شاگردانِ رشید کا حال بھی سن لیجئے۔

تلامذہ ابن کثیر

ان کے تلامذہ حدیث میں تو متعدد ہیں جن میں بعض ثقہ بھی ہیں مگر قرأت میں ان کے دو شاگرد قرأت والوں کے نزدیک مشہور ہیں جن میں سے ایک قنبل ہیں۔ ان کا پورا نام و نسب یہ ہے۔ محمد بن عبدالرحمن بن محمد بن خالد بن سعید بن جرجۃ المخزومی المکی۔ یہ مخزومیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ "قنبل" ان کا لقب تھا۔ ۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ قرأت کا فن ابوالحسن القواس وغیرہ سے سیکھا۔ مگر عبداللہ بن کثیر سے ان کا قرآن مجید پڑھنا یا قرأت کا فن حاصل کرنا ائمہ رجال نہیں لکھتے۔ تیسیر میں ابو عمرو الدانی ان کا سالِ وفات ۲۹۱ھ لکھتے ہیں۔ ۲۹۱ھ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اپنی وفات سے سات برس پہلے کچھ مختل الحواس ہو گئے تھے۔ اس زمانہ اختلال میں ان سے لوگ قرآن مجید نہیں پڑھتے تھے۔ بہر حال ان کو ائمہ رجال عبداللہ بن کثیر کا شاگرد نہیں لکھتے ہیں۔ ان کے ترجمہ میں بھی ابن حجر لکھتے ہیں کہ انھوں نے قرأت کا فن احمد بن محمد بن عون القواس (کمان ساز) النبال ابی الحسن المقری سے حاصل کیا تھا۔ اور قواس کے ترجمے میں بھی لکھتے ہیں کہ ان سے قنبل نے قرأت حاصل کی تھی۔ مگر قواس صاحب ممدوح نے قرأت کا فن ایک گمنام مجہول الحال شخص ابوالاخریط وہب بن واضح سے حاصل کیا تھا۔ یہ معلوم ہے کہ ان ابوالاخریط صاحب نے کس سے قرأت کا فن سیکھا تھا۔ نہ یہ پتہ ملتا ہے کہ یہ کس قبیلے کے رہنے والے تھے۔ لیکن ائمہ قرأت نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر قاری کے دو شاگرد کسی نہ کسی طرح ضرور پیش کر دیئے جائیں۔ کیونکہ دو سے زیادہ قرأت کے شاگرد کسی کے بھی پیدا ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ عبداللہ بن کثیر کے دو شاگرد بھی نہیں رہے تھے۔ صرف ایک شاگرد رشید ان کے تھے وہ بھی بالواسطہ جن کا نام

لہ مولانا مودودی نے عبداللہ بن کثیر کو صرف حضرت عبداللہ بن کثیر رضی اللہ عنہ کا شاگرد لکھ کر بڑی خیانت کی ہے۔ مجاہد بن جبیر جو ابن کثیر کے متفق علیہ اور مشہور استاد تھے ان کا ذکر تک نہ کیا۔ اور ابو عمرو الدانی نے بلا دلیل خلاف جمہور اور خلاف قیاس بات لکھ دی۔ اسی کو لکھ دیا۔ کیا علمی تحقیق اسی کا نام ہے؟ کہ غلط کر کے اور خلاف قیاس ایک شخص واحد کا بلا دلیل قول تو نقل کیا جائے۔ اور جمہور ائمہ رجال کا متفق علیہ قول ترک کر دیا جائے! الا ساء ما یحکمون۔ ۱۲ تمنا عفی عنہ

نامی ابھی آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس لئے زبردستی قنبل غریب کو جس نے کبھی ایک آیت بھی غالباً عبداللہ بن کثیرؒ کو نہیں سنائی ہوگی بلکہ ایک دوسرے کے شاگرد تھے۔ اپنی کتابوں میں ان کو عبداللہ بن کثیر کا شاگرد لکھدیا۔ لیکن یہ بھی مخزومیوں کے غلام آزاد کردہ ہی تھے اور مکے ہی میں رہتے تھے۔

بزی یعنی احمد بن محمد بن عبداللہ بن القسم بن ابزہ بن نافع بن ابی بزہ۔ جو مکہ معظمہ میں مؤذن تھے۔ یہ بھی مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے ان کا مفصل ترجمہ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۱ صفحہ ۲۸۴ میں لکھا ہے۔ یہ منکر الحدیث، غیر ثقہ من گھڑت حدیثیں روایت کرنے والے تھے۔ جس کا یہ برتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کہ جھوٹی باتیں آپ کی طرف منسوب کرے وہ قرآن مجید کا احترام کہاں تک باقی رکھے گا۔ ہر صاحب عقل سلیم سمجھ سکتا ہے۔ انھیں من گھڑت حدیثوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عکرمہ بن سلیمان سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے اسمٰعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کے سامنے قرآن مجید پڑھا۔ تو جب والضحیٰ پر میں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ اللہ اکبر کہو یہاں سے ہر سورہ کے خاتمے پر۔ میں نے بھی عبداللہ بن کثیر کے سامنے قرآن پڑھا تھا تو انھوں نے مجھ سے کہا تھا جب میں والضحیٰ پر پہنچا کہ تکبیر کہو یہاں سے ہر سورہ کے خاتمہ پر۔ اور عبداللہ بن کثیر نے ان کو خبر دی کہ انھوں نے مجاہد بن جبیر کے سامنے جب قرآن مجید پڑھا تو اسی بات کا انھوں نے ان کو حکم دیا تھا۔ اور خبر دی تھی کہ جب انھوں نے یعنی مجاہد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے قرآن پڑھا تھا تو انھوں نے بھی مجاہد سے یہی کہا تھا۔ اور حضرت ابن عباس نے مجاہد سے کہا کہ مجھ کو ابی ابن کعبؓ نے اس کی خبر دی تھی اور ابی بن کعب نے ابن عباس سے کہا کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم فرمایا تھا۔

ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث غریب اور محدثین نے "بزی" کی اس حدیث سے انکار کیا ہے۔ ابوحاتم نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ غرض یہ حدیث محدثین اور نقادانِ حدیث کے نزدیک محض موضوع اور بزی صاحب کی من گھڑت ہے۔ ان کے سوا کوئی بھی اس کی روایت نہیں کرتا۔ مگر قرأت والوں کے ہاں یہ حدیث معتبر سمجھی جاتی ہے اور اس کو مسنون بلکہ بعضے سنت مؤکدہ قرار دے کر اسکی پابندی کرتے ہیں خصوصاً جو لوگ عبداللہ بن کثیر کے اسناد کے پابند ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سنت نہیں بلکہ بدعت ہے اور اسکی پابندی یا اس کی حمایت کذب علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور سراسر گناہ اور گمراہی ہے لیکن اس روایت سے یہ بات تو ضرور ثابت ہوگئی کہ یہ بزی صاحب بھی عبداللہ بن کثیر کے بلاواسطہ شاگرد نہ تھے بلکہ یہ شاگرد تھے اسمٰعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کے اور وہ شاگرد تھے عبداللہ بن کثیر کے۔ مگر یہ اسمٰعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کون ہیں اس کا پتہ نہیں مل سکا۔ ابن حجر، امام ذہبی، کسی نے ان کا کچھ بھی ذکر کسی کتاب میں نہیں کیا ہے۔ یہ ابن قسطنطین بھی ابوالاخریط قنبل کے استاد الاستاد کی طرح بالکل مجہول الحال ہیں۔ اسی لئے یارانِ طریقت نے قنبل و بزی دونوں کو بلاواسطہ عبداللہ بن کثیر کا شاگرد لکھدیا کہ جو دیکھے گا صحیح ہی سمجھ لے گا۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ کرید کرے گا مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ ایک ہزار برس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندے تمنا عمادی کو اس کی توفیق دیگا کہ وہ اس فتنۂ موالی کا پردہ چاک کرکے آفتاب قرآن کے چہرہ تاباں سے غبارِ اختلافات دور کردے۔ وقد قال اللہ عز وجل ان الذین یلحدون فی اٰیاتنا لا یخفون علینا۔

تو یہ معلوم ہو گیا کہ عبداللہ بن کثیر بھی آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے استاد مجاہد بھی مخزومیوں کے غلام تھے اور ان کے دونوں شاگرد بھی مخزومیوں کے غلام تھے۔ مکہ و مدینہ زادہما اللہ شرفاً دونوں کے عزو شرف کے باوجود دونوں کی قسمت دیکھئے کہ ان دونوں کو امام القرأت ملے تو موالی (آزاد کردہ غلام) ہی ملے۔ اولاد صحابہ و اکابر تابعین میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو حرمین شریفین کی امامت قرأت کے منصب کا اہل ہوتا۔ عجمی الاصل یا آفاقی غیر قریشی مکہ مدینہ میں رہ کر ہزار قریشی لب و لہجہ سیکھیں مگر خود قریشیوں کا جو فطری و جبلی لب و لہجہ تھا وہ ان کو کہاں میسر ہو سکتا تھا۔ پھر جو لوگ بچپن سے بیسیوں بلکہ سینکڑوں صحابہؓ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتے آئے تھے اور خود پڑھتے رہے یہ موالی کبھی ان کو پا سکتے تھے؟ حاشا وکلا کبھی نہیں۔ مگر یہاں تو موالیوں ہی کی سازش کے ماتحت اختلافات قرأت کی تحریک چلائی گئی تھی اس میں اولاد صحابہ و اکابر تابعین کو کس طرح شریک کیا جا سکتا۔ مدینے میں نافع اور مکہ میں مجاہد کوفیوں کے دو ایجنٹ بٹھا دیئے گئے تھے کہ چپ چاپ اپنے پر تکلف زہد و درع کے ذریعے ان جگہوں کے اکابر و اصاغر کے دلوں میں اپنا رسوخ قائم کئے رہیں۔ اکابر سے حدیثیں سنیں اور اصاغر سے صرف حدیثیں بیان کریں۔ قرآن مجید نہ لوگوں سے پڑھیں۔ نہ ان میں سے کسی کو پڑھائیں۔ قرآن کی تعلیم و تعلم اپنے حلقے سے باہر نہ ہو۔ کیونکہ جو اختلافات پھیلانا ہیں اگر ان کی رازداری آغاز میں نہ کی گئی اور اکابر تابعین و اولاد صحابہ رضی اللہ عنہم پر سازش کا راز کہیں کھل گیا۔ تو پھر یہ سازش اور اس کے ماتحت اختلاف قرأت کی تحریک ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی۔

حرمین شریفین کے دونوں اسکول قرأت اور ان کے ہیڈ ماسٹروں اور اسٹوڈنٹوں کا حال تو آپ کو پوری طرح معلوم ہو گیا۔ اب دوسرے مقامات کے اسکولوں کا بھی معائنہ کر لیجئے۔

ابو عمرو بن العلا البصری التمیمی

ولادت ۶۸ھ وفات ۱۵۴ھ عمر ۸۶ سال

مولانا مودودی نے سال وفات ۱۵۵ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے اور بعضوں نے ۱۵۷ھ لکھ دیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ بہرحال یہ ابو عمرو بن العلاء بن عمار التمیمی بصرے کے رہنے والے تھے۔ ائمہ رجال ان کی توثیق کرتے ہیں۔ حسب تصریح ابن حجر (تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۱۷۸) انھوں نے حمید بن قیس الاعرج۔ یحییٰ بن یعمر، مجاہد بن جبیر۔ سعید بن جبیر۔ عکرمۃ البربری اور عبداللہ بن کثیر سے قرآن پڑھا تھا۔ اور ان سے عبدالوارث بن سعید۔ حماد بن زید۔ معاذ بن معاذ، ہارون الاعور، یونس بن حبیب النحوی۔ یحییٰ بن المبارک الیزیدی، ابو بحر البکراوی۔ خارجہ بن مصعب اور عبدالوہاب بن عطاء وغیرہم نے قرآن پڑھا تھا تو اب پہلے ان کے شیوخ سے تعارف حاصل کر لیجئے۔ اس کے بعد ان کے کلامذہ سے بھی مصافحہ کر لیجئے گا۔

حمید بن قیس الاعرج ابو صفوان المکی الاسدی۔ یہ اسدیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے مجاہد سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ مگر ان سے قرآن پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ کوئی بھی یہ نہیں بتاتا کہ انھوں نے فن قرأت کس سے سیکھا۔ ان کے ترجمے میں ان کو قاری

دمشقی بھی نہیں لکھا ہے۔ یہ بھی مذکور نہیں کہ ان سے ابوعمرو بن العلاء نے قرآن پڑھا تھا۔ ابوبکر بن العلاء سے ۴۴ برس پہلے سنہ ۱۳۰ھ میں وفات پائی۔

یحییٰ بن یعمر المروزی البصری۔ مرو کے رہنے والے تھے۔ بصرے میں آبسے تھے۔ پھر مرو میں قاضی بھی مقرر ہوئے تھے۔ شراب منقّح پیتے تھے۔ اس لئے معزول کر دیئے گئے تھے۔ بڑے ادیب ماہر عربیت عالم لغت اور مشہور نحوی تھے۔ حسین بن الولید ہارون بن موسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ قرآن مجید پر سب سے پہلے نقطے انھیں نے لگائے۔ نحو میں ابی الاسود الدؤلی کے شاگرد تھے۔ ان کے سال وفات میں اختلاف ہے۔ کسی نے سنہ ۱۲۹ھ کسی نے سنہ ۱۲۰ھ تک لکھا ہے۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ ان کی وفات سنہ ۸۹ھ میں عمرو بن العلاء سے ۶۵ سال پہلے ہوئی تھی اس لئے ان سے عمرو بن العلاء کا پڑھنا ذرا مشتبہ ہے۔ خلاصۃ التہذیب صفحہ ۴۲۹ میں لکھا ہے کہ سنہ ۹۰ھ سے پہلے خراسان میں وفات پائی۔ اس لئے سنہ ۸۹ھ ہی میں وفات کی روایت صحیح ہے۔

مجاہد بن جبیر سے تو آپ پوری طرح واقف ہو چکے ہیں کہ وہ مخزومیوں کے غلام آزاد کردہ تھے اور کوفیوں کے ایجنٹ بن کر کیسے اختلاف قرأت کی کھچڑی چپکے چپکے پکا رہے تھے۔ ان کے بعض حالات میں نے وہاں نہیں لکھے تھے وہ کمی یہاں پوری کر دوں۔ تو سنتے سنئے۔ ان کی تفسیر بہت مشہور ہے مگر ابن حجر تہذیب التہذیب ج۱۰ صفحہ ۴۳ میں لکھتے ہیں کہ "مجاہد سے ان کی تفسیر قاسم بن ابی بزہ کے سوا اور کسی نے نہیں سنی تھی۔ جس نے بھی مجاہد کی تفسیر پائی ہے وہ قاسم بن ابی بزہ کی کتاب سے ہے۔" اس لئے بروایت مجاہد ان کی تفسیر دوسروں کو ملی ہے۔ اور ج۱۰ صفحہ ۴۳ ترجمہ مجاہد میں لکھتے ہیں کہ "ابوبکر بن عیاش نے اعمش سے پوچھا کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے پرہیز کیوں کرتے ہیں؟ تو اعمش نے جواب دیا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اہل کتاب سے پوچھ پوچھ کے تفسیر لکھی ہے۔ مجاہد نے ایک موقع پر کہا تھا کہ خرج علینا علیؓ یعنی حضرت علی ہم لوگوں کے سامنے آئے۔ یحییٰ بن معین مشہور محدث فرماتے ہیں کہ یہ کچھ بھی نہیں بے اصل بات ہے۔ مجاہد کی روایتیں حضرت علیؓ سے مرسل ہیں۔ مجاہد حضرت سعد، حضرت معاویہ، حضرت کعب بن عجرہ، حضرت ابوہریرہ، اور حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی جو روایت کرتے ہیں وہ مرسل ہیں۔ اسی طرح ابوسعید خدری اور رافع بن خدیج سے بھی بلا واسطہ ان کی روایتیں صحیح نہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ پیشاب کر کے پانی نہیں لیتے تھے۔ ترمذی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا مدلس ہونا معلوم ہے۔ اسلئے

۱؎ قرآن مجید پر نقطے لگانا اور بات ہے اور عربی رسم خط میں نقطوں کا ایجاد کرنا اور بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوفے والوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات کے بعد بے نقطوں کے قرآن لکھنا شروع کیا اور مشہور کیا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تھا کہ قرآن میں نقطے نہ دیا کرو۔ جس کی وجہ سے کوفہ بصرہ وغیرہ میں غیر منقوط قرآن مروج ہو گیا۔ لوگوں کو اس کا موقع مل گیا کہ یعلمون کو تعلمون پڑھیں۔ اس خرابی کو محسوس کر کے ابھرنے والوں میں سب سے پہلے یحییٰ بن یعمر نے اپنے مصحف پر نقطے لگائے پھر ان کے دیکھنے سے دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ سمجھنا کہ یحییٰ بن یعمر ہی عربی رسم خط میں حروف پر نقطے لگانے کے موجد تھے، غلط ہے جس کی مفصل بحث میں اس مضمون کے تمہید میں کر چکا ہوں اور دلائل قطعیہ سے ثابت کر چکا ہوں کہ عربی رسم خط کے حروف جس نے وضع کئے تھے یہ ناممکن ہے کہ اس نے پہلے صرف حروف وضع کئے ہوں اور نقطے بعد والوں نے ایجاد کر کے لگائے ہوں۔ ۱۲ تمنا غفرلہ

اگر عن فلاں عن فلاں کہکے بھی کسی حدیث کی روایت کریں تو ان کے سلسلہ اسناد کا فی الواقع متصل ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ تدلیس سے کام لیا ہو۔ اب وہاں کی اور یہاں کی سب باتیں چھوڑ کر مجاہد کے حالات پر غور فرما لیجئے۔

سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی۔ جو اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے۔ کوفی تھے۔ ابن الاشعث کے ساتھ خلیفۂ وقت عبدالملک بن مروان کے خلاف باغیانہ خروج کیا تھا۔ ابن الاشعث کو جب شکست ہوئی تو یہ بھاگ نکلے اور ادھر ادھر چھپتے پھرے آخر ایک مدت کے بعد مکہ معظمہ میں گرفتار ہو گئے۔ حجاج بن یوسف والیٔ عراق کے پاس لائے گئے۔ حجاج نے پہلے وہ احسانات جتلائے جو ان کے ساتھ کئے گئے تھے۔ انھوں نے قبول کیا کہ بے شک مجھ پر احسانات ہیں تو خروج کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ ہم بیعت کر چکے تھے اسلئے مجبور ہو گئے۔ حجاج نے کہا کہ امیر المومنین کی بیعت کا حق پورا کرنا مقدم تھا یا باغی کی بیعت کا حق پورا کرنا؟ ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ آخر سنہ ۹۵ھ میں (۴۹) برس کی عمر میں مارے گئے۔ مگر بڑے محدث اور ثقہ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر تھے یہ بھی بنی اسد کے غلام آزاد کردہ اصلی پھر کوفی تھے۔ یہ بھی ایک بات سمجھنے کی ہے کہ جن جن لوگوں کو بغاوت یا فتنہ و فساد کے سبب سے حجاج نے قتل کیا تھا۔ ان لوگوں کو اہل کوفہ نے بہت بڑھایا ہے کہ ایسے تھے اور ویسے تھے۔ پھر بھی ان کے علم و فضل کا کچھ نہ کیا اور حجاج نے انھیں قتل کر دیا۔ اور پھر باہر والوں نے بھی اہل کوفہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الفتنۃ اشد من القتل عراق فتنہ پردازوں سے بھرا ہوا تھا اور کوفہ ان کا اصل مرکز تھا۔ یہ موقع اس کا نہیں کہ ہم کوفہ و عراق کی سازشوں اور وہاں کے فتنوں پر بحث کریں۔ انشاء اللہ کبھی موقع ملا تو اس پر مستقل طور سے قلم اٹھاؤں گا۔ اس وقت تو ہمیں فقط یہ دکھانا ہے کہ اختلافات قرآت کی تحریک عجمی سازش کا نتیجہ تھی اور عجمی الاصل غلاموں ہی نے یہ تحریک اٹھائی اور انھیں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ اور کوفہ ہی اس تحریک کا خاص مرکز تھا۔ سعید بن جبیر چاہے محدثین کے نزدیک کتنے ہی بڑے محدث اور ثقہ ہوں مگر تھے عجمی الاصل ایک آزاد کردہ غلام، اور پھر کوفی تھے۔ مگر ان کے ترجمے میں ان کا ذکر نہیں ہے کہ یہ قاری یا مقری تھے۔ مگر اصطلاحی قاری نہ سہی لغوی حیثیت سے ہر محدث کو قاری و مقری ہونا چاہیے اور عام اصطلاح کے اعتبار سے تو قاری حافظ قرآن کو کہتے تھے۔ اور ہر محدث حافظ قرآن ضرور ہوتا تھا۔ جس کو قرآن یاد نہ ہو وہ حدیث کیا یاد کرے گا۔ مگر کسی نے یہ بھی نہیں لکھا کہ ابو عمرو بن العلاء نے یا کسی اور نے ان سے قرآن پڑھا تھا یا قرآت کا فن سیکھا تھا اور نہ قرین قیاس ہے کہ ابو عمرو بن العلاء کو ان سے قرآن پڑھنے کا وقت ملا ہو کیونکہ عبدالرحمٰن بن الاشعث نے ۱۴ جمادی الآخری سنہ ۸۳ھ کو شکست کھائی تھی۔ سنہ ۸۳ھ سے یہ برابر روپوش رہے اور سنہ ۹۵ھ میں آخر مارے گئے۔ ابو عمرو بن العلاء کی پیدائش سنہ ۶۸ھ کی ہے ابن الاشعث کی شکست کے وقت ابو عمرو پندرہ برس کے تھے۔ بلکہ حجاج بن یوسف نے سیستان کی مہم پر عبداللہ بن ابی بکرہ کی مدد کے لئے سنہ ۷۹ھ میں بیس ہزار بصریوں کی فوج اور بیس ہزار کوفیوں کی فوج دے کر عبدالرحمٰن بن الاشعث کو سیستان کی طرف بھیجا تھا۔ کوفیوں کی اسی فوج میں سعید بن جبیر بھی تھے۔ اس مہم سے واپسی کے قبل ہی اسی سال ۸۱ اتیوں نے ابن الاشعث کی سرکردگی میں خلافت سے بغاوت کی اور عبدالرحمٰن بن الاشعث کو خلیفہ تسلیم کر کے ابن الاشعث کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت میں سعید بن جبیر بھی شریک تھے۔ اسی بیعت کا ذکر سعید بن جبیر نے اپنے قتل کے دن حجاج کے سامنے کیا تھا غرض سعید بن جبیر سنہ ۸۳ھ سے پہلے بڑے

محدث ہوں مجھ کو اس سے انکار نہیں مگر وہ ۷۳ھ سے سرگرم سیاست اور مرد میدان بغاوت ہے۔ ۷۲ھ میں ابو عمرو بن العلاء چار برس کے تھے۔ اور ۷۳ھ سے ۹۵ھ تک یعنی آغاز جہاد پھر ابتدائے بغاوت، پھر شکست پھر روپوشی، پھر قتل تک ۲۳ برس کی مدت میں کچھ حدیثوں کی روایت کا موقع مل سکتا تھا۔ مگر اس کا موقع ملنا ممکن نہ تھا کہ وہ کسی کو پورا قرآن فن قرأت کے ماتحت ایک جگہ بیٹھ کر پڑھاتے۔ اس لئے سعید بن جبیر سے ابو عمرو بن علا کا قرآن پڑھنا اور فن قرأت سیکھنا بالکل ناممکن ہے۔

عکرمۃ البربری۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام تھے اور مشہور محدث و مفسر تھے۔ حضرت ابن عباس کے شاگرد تھے۔ مگر یحییٰ بن سعید الانصاری عکرمہ کو کذاب کہتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے غلام نافع سے کہتے تھے کہ جس طرح عکرمہ جھوٹی باتیں ابن عباس کی طرف منسوب کیا کرتا ہے اسی طرح تم بھی مجھ پر جھوٹی باتیں نہ لگایا کرو۔ امام مالک عکرمہ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آخر میں خوارج کا مسلک عکرمہ نے اختیار کر لیا تھا پہلے ریاضیہ بنے جو خوارج کا کسی قدر معتدل فرقہ تھا۔ اس کے بعد صفریہ بنے جو غالی و متعصب فرقہ تھا۔ ایک بار کچھ لوگوں میں عکرمہ نے کہا کہ ایک دن ابن عباس نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی لم تعظون قوما اللہ مھلکھم او معذبھم عذابا شدیدا۔ اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ قوم ہلاک ہو گئی۔ یا اس کو نجات بخشی گئی (عکرمہ کہتے ہیں کہ) میں ان کو سمجھاتا رہا یہاں تک کہ وہ سمجھ گئے کہ اس قوم نے نجات پائی۔ تو ابن عباس نے (خوش ہو کر) مجھ کو پوشاک پہنائی۔ (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۵ یہ سراسر افتراء اور بہتان ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر۔ اور اس روایت سے حضرت شعبہ کے اس قول کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو انھوں نے سفیان ثوری سے کہا تھا کہ کلما تقدمتم فی الحدیث تاخرتم عن القرآن جہاں تک تم حدیث میں آگے بڑھو گے وہاں تک قرآن سے پیچھے ہٹتے جاؤ گے۔ یعنی جن لوگوں کے سامنے عکرمہ نے یہ کہا تھا ان میں سے کسی کو بھی قرآن مجید یا کم سے کم سورۂ اعراف کا اکیسواں رکوع یاد نہ تھا کہ وہ عکرمہ کو جھٹلاتا۔ اور راوی کو یہ توفیق ہوئی کہ عکرمہ سے حکایت نقل کرنے سے پہلے قرآن مجید میں یہ آیت دیکھ لیتا۔ یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی اپنی کتاب میں یہ روایت نقل کرنے کے وقت قرآن مجید کی اس پوری آیت پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ سورہ اعراف کا اکیسواں رکوع اس کی ایک سو تریسٹھویں آیت سے شروع ہوتا ہے اور ایک سو چھیاسٹھویں آیت پر بنی اسرائیل کی تین جماعتوں کے حالات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ چار آیتیں مع ترجمہ حسب ذیل ہیں۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۙ لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝

اور تم بنی اسرائیل سے اس بستی کا حال پوچھو جو سمندر کے کنارے آباد تھی جب سنیچر (کے دن) مچھلیوں کے شکار سے ممانعت کے بارے میں زیادتیاں کر رہے تھے کہ جب ان کے سنیچر کے دن مچھلیاں ان کے سامنے تیرتی جمع ہو جاتی تھیں۔ اور جب سنیچر کا دن نہیں ہوتا تو مچھلیاں نہیں آتیں۔ ہم ان کو ان کی بدکرداری کی وجہ سے اس طرح آزماتے رہے۔ اور جب ان میں سے ایک جماعت نے (ان کی دوسری) جماعت کو کہا کہ تم لوگ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے۔ یا سخت عذاب میں مبتلا کر دینے والا ہے تو ان نصیحت کرنے والوں نے کہا کہ ان کے رب کے آگے عذر کرنے کے لئے اور شاید یہ لوگ اللہ سے ڈریں۔ تو جب وہ نصیحتیں جو ان کو کی گئی تھیں وہ لوگ بھول گئے تو جو لوگ انہیں برائی سے روکتے تھے ہم نے ان کو بچا لیا۔ اور ظالموں کو ہم نے ان کی بدکرداری کے سبب سے ایک خوفناک عذاب میں مبتلا کر دیا۔ تو جب سرکشی کی انہوں نے اور نہ مانی وہ بات جس سے منع کئے گئے تھے تو ہم نے کہا کہ ہو جاؤ ذلیل و رسوا بندر۔

حضرت داؤد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت سرکش اور نافرمان تھی اور دو جماعتیں مومنین کی تھیں۔ مگر مومنین کی دو جماعتوں میں سے ایک جماعت نے سرکشوں سے ترک موالات کر کے بالکل علیحدگی اختیار کر لی تھی اور ایک جماعت ان سرکشوں کے ساتھ رہتی تو تھی لیکن ان کو وعظ نصیحت کرتی رہتی تھی۔ بنی اسرائیل کو سنیچر کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا گیا تھا۔ ان کی بستی سمندر کے کنارے واقع تھی۔ مچھلی کے شکار کے یہ عادی تھے۔ ان کی آزمائش کے لئے سنیچر کے دن ہر طرف سمندر میں مچھلیاں ہی مچھلیاں ان کو ملتی تھیں۔ اور سنیچر گذر جاتا تو ایک مچھلی پر بھی نظر نہیں پڑتی تھی۔ ان لوگوں نے حیلہ سازی کی کہ سنیچر کے دن سمندر کے قریب ایک گڑھا کھود کر پانی بھر کر اس میں مچھلیوں کو ہنکا کر جمع کر لیتے اور اتوار کو خوب کھاتے۔ جو مومنین ان کے ساتھ رہتے تھے وہ ان کو بہت سمجھاتے اور اس حیلہ سازی سے منع کرتے تھے تو وہ مومنین جو ترک موالات کر چکے تھے ان وعظ نصیحت کرنے والی جماعت مومنین سے کہتے تھے کہ تم لوگ ایسی قوم کو کیا نصیحت کرتے ہو۔ جو اللہ کے عذاب میں پڑنے والے یا ہلاک ہونے والے ہیں تو وہ کہتے تھے کہ ہم ان کے ساتھ یوں ہیں اس کے لئے ان کے رب کے آگے عذر پیش کرنے کے لئے کہ ہمارا مقصد ان کے ساتھ اسی قدر تھا کہ ان کو وعظ نصیحت کرتے رہنے کا مامور تھے اور ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور پھر یہ امید کرتے ہیں کہ یہ سب نہیں تو ان میں سے کچھ ہی سہی اللہ سے ڈریں اور اپنی بدکرداریوں سے توبہ کریں۔

مگر جب باوجود وعظ و نصیحت اور احکام خداوندی کی یاد دہانی عذاب الٰہی و بازپرس آخرت سے تخویف کے اللہ تعالےٰ نے ان نصیحت کرنے والے مومنین کو اس عذاب سے بچا لیا۔ اور وہی لوگ اس عذاب میں پڑے جو اپنی جانوں پر آپ ظلم کر رہے تھے۔ وہ کیسا خوفناک عذاب تھا اس کو بھی بتا دیا کہ وہ بندروں کی صورت میں مسخ کر دیئے گئے۔

ان تین جماعتوں میں سے جو مومنین ان ظالموں سے ترک موالات کر کے الگ ہو چکے تھے۔ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ بھی عذاب سے محفوظ رہے۔ وہ کیوں عذاب میں مبتلا ہوتے؟ نہ ان میں بدکرداری تھی نہ وہ بدکرداروں کے ساتھ تھے۔

البتہ جماعت مومنین مخلصین میں سے وہ لوگ جو ان بدکرداروں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے۔ مگر ان کی بدکرداری میں شریک نہ تھے بلکہ ان کو بدکرداریوں سے روکتے، منع کرتے اور سمجھاتے رہتے تھے۔ خطرہ اگر تھا تو انہیں کے متعلق۔ کہ ایسا نہ ہو عذاب آئے تو یہ [illegible]

کے ساتھ نیک کردار لوگ بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ تو بتا دیا گیا ایسا نہیں ہوا۔ ہم نے ان نصیحت کرنے والے مومنین کو بچا لیا۔ عذاب الٰہی یعنی بندر کی فطرت میں مسخ ہونے والے وہی لوگ مبتلا ہوئے جو بدکردار تھے۔

کس قدر صاف اور واضح چار مسلسل آیتیں ہیں۔ تینوں جماعتوں کا حال جن سے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو کس جماعت کے متعلق یہ خیال ہوا کہ "معلوم نہیں کہ ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ عذاب میں پڑے یا ان کو نجات ملی؟" یہ سوال ان کے ذہن میں کس جماعت کے متعلق پیدا ہوا؟ فاسقین کو بائیکاٹ کرنے والے مومنین کے متعلق تو پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ یقیناً فاسقین کے متعلق پیدا ہوا ہوگا یا ان مومنین کے متعلق جو فاسقین کے ساتھ رہ کر ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تو دونوں کے متعلق صاف اعلان ہے کہ وعظ و نصیحت کرنے والے مومنین کو بچا لیا گیا اور ظالموں کو مسخ کر دیا گیا۔ پھر یہ سوال کیسا؟ اصل یہ ہے کہ عکرمہ صاحب کو قرآن مجید حفظ تو تھا نہیں۔ نہ قرآن مجید کی تلاوت کا معمول رکھتے تھے۔ درمیان آیت کا ایک ٹکڑا ذہن میں آ گیا۔ مجمع تھا عوام کا اس کے متعلق ایک بات بنا کر عوام کے سامنے کہہ دی جس سے اپنی بڑائی ظاہر ہو۔ مگر تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر نے ان روایات کو ان آیات سے ملا کر کیوں غور نہیں فرمایا اور اس روایت کی تکذیب کیوں نہ کی۔ اس کا سبب وہی روایت پرستی ہے۔ اس کی مثال اور بھی ملتی ہے اور مجھے یاد ہے کہ محدثین بعض وقت روایت لکھ لیتے ہیں مگر قرآن مجید کی آیت سے ملا کر غور نہیں کر لیتے۔ باوجودیکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ جو حدیث ہم سے روایت کی جائے اسکو قرآن کے سامنے پیش کرو۔ قرآن کے مطابق ہو تو قبول کرو ورنہ رد کر دو۔ تو جب اقوال منسوب برسول کو بغیر قرآنی کسوٹی پر کسے قبول کرنا جائز نہیں تو آثار و صحابہ کو بغیر قرآنی کسوٹی پر کسے کس طرح محدثین و مفسرین قبول کرتے رہے۔ تعجب ہی تعجب ہے۔

ان حالات میں جن لوگوں نے عکرمہ بربری جو حضرت ابن عباسؓ کے غلام تھے جن کو حضرت ابن عباسؓ نے اپنی زندگی میں آزاد بھی نہیں کیا تھا۔ اگر ان کو یحییٰ بن سعید الانصاری بعض ائمہ رجال نے کذاب لکھا اور امام مالک ان سے بیزار رہتے تھے تو کیا غلط تھا؟

اور عکرمہ کو کسی نے بھی قاری و مقری نہیں لکھا ہے۔ نہ ان کے ترجمے میں کہیں مذکور ہے کہ ان سے ابو عمرو بن العلاء یا کسی نے بھی قرآن پڑھا تھا۔ اس لئے ان سے بھی ابو عمرو بن العلاء کا فن قرأت سیکھنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عکرمہ کی وفات کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ خود ان کی بیٹی کی روایت ۱۰۵ھ کی ہے۔ ورنہ کسی نے ۱۰۵ھ کسی نے ۱۰۷ھ کسی نے ۱۱۰ھ اور کسی نے ۱۱۵ھ کہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

عبداللہ بن کثیر۔ یہ ضرور قاری مقری تھے اور کوفیوں کے قائم کردہ اسکول قرأت جو مکہ معظمہ کے کسی گوشے میں تھا اسکے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ممکن ہے ابو عمرو بن العلاء نے انھیں سے قرأت کا فن حاصل کیا ہو۔ اور بصرے کے قاریوں نے ان کے اساتذۂ قرآن کی ایک فہرست بنا رکھی ہو جس کے مطابق ابن حجر نے ان کے ترجمے سے اپنی کتاب میں وہ فہرست درج کر لی۔ ان کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس کی کرید کرتے کہ یہ فہرست صحیح ہے یا نہیں۔ قاریوں میں سے ان کے متقدمین نے اپنے اپنے شیوخ کے متعلق جو کچھ ائمہ رجال

سے بیان کیا انھوں نے اس کو لکھ لیا کہ اہل البیت ادری بما فیہ قراءت کے اسکول کا حال یہ قرا ہی ہم سے زیادہ جانتے ہیں جو ان اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر یا کسی درجے کے ٹیچر یا اسٹوڈنٹ ہیں یا رہ چکے ہیں۔ اس لئے اپنے متعلق یا اپنے متقدمین کے متعلق جو کچھ قاریوں نے بتایا ائمہ رجال نے لکھا۔ ابن حجر کا اس بنا پر کوئی قصور نہیں ہے کہ انھوں نے ابوعمرو بن العلاء کے شیوخ میں ایسے لوگوں کے نام کیوں لکھ دیئے جن سے ان کا قرآن پڑھنا مستبعد ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب عبداللہ بن کثیر کے خاص شاگرد بلا واسطہ ابوعمرو بن علاء تھے تو پھر عبداللہ بن کثیر کے جانشین اور ان کی قراءت کے راوی دوسری جگہ سے مستعار کیوں لئے گئے؟ ابوعمرو بن العلاء ہی نہیں بلکہ مکے کے رہنے والے شبل بن عباد بھی عبداللہ بن کثیر کے شاگرد تھے۔ اور شجاع بن ابی النصر البلخی ابوالنعیم المقری نے بھی قراءت کا فن عبداللہ بن کثیر سے سیکھا تھا۔ لیکن شجاع اور شبل یہ دونوں کسی کے آزاد کردہ غلام نہیں تھے۔ قرآن پڑھنے کے لئے آئے سیدھا سادا قرآن جس طرح سب مسلمان پڑھتے تھے پڑھا دیا گیا ان کو وہ اختلافات کا گُر نہیں بتا سکتے تھے۔ اور ان آزادوں پر اتنا اعتماد بھی نہ تھا کہ یہ دونوں سازش میں شریک ہو جائیں اس لئے یہ جانشینی کے قابل نہ تھے۔ اور ابوعمرو بن العلاء خود بصرے کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے تھے۔ وہاں سے لاکر مکے کے اسکول میں ان کو بٹھا دیا جاتا تو پھر بصرے کے لئے کسی کا آمد دوسرے آزاد کردہ غلام کی تلاش کرنی پڑتی۔ اور سازش میں شریک ہونے والے قابلِ اعتماد لوگوں کا زیادہ ملنا کچھ آسان نہ تھا۔ اس لئے مستعار ہی سہی۔ کام چلانے کے لئے ایک شاگرد کے شاگرد کو پکڑ لیا گیا، اور ایک دوسرے کے شاگرد کو مستعار لیا گیا۔ اور اس طرح مکہ اور بصرہ دونوں جگہ کے اسکول چالو بنا لئے گئے۔

عبداللہ بن عامر (ولادت ۲۱ھ وفات ۱۱۸ھ)

زیادہ تر ائمہ رجال تو ۲۱ھ ہی میں لکھتے ہیں مگر ان کے ایک شاگرد خالد بن یزید بن صالح بن صبیح المری نے ان کا سالِ ولادت ۸ھ بیان کیا ہے۔ مگر حافظ ابن حجر نے اس کو یُروی کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے۔ اس قول کا ضعف اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ نہیں معلوم کہ خالد بن یزید المری نے کس سے کہا تھا اور کس ذریعے سے یہ روایت حافظ ابن حجر تک پہنچی اور خود خالد بن یزید کو ان کا سالِ ولادت کس سے معلوم ہوا؟ مگر مولانا مودودی نے اسی ضعیف قول کو نقل کیا ہے۔ اس حساب سے ان کی عمر ایک سو دس برس کی ٹھہرے گی مگر ائمہ رجال ان کو معمر لوگوں میں لکھتے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۷۴ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن مجید مغیرہ بن ابی شہاب سے پڑھا تھا۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں مغیرہ بن شہاب بہرحال جناب مغیرہ ممدوح کے والد ماجد شہاب ہوں یا ابوشہاب، لیکن ائمہ رجال شہاب یا ابی شہاب کے صاحبزادے جناب مغیرہ کا کہیں ذکر نہیں کرتے ہیں۔ لے دے کے بس عبداللہ بن عامر کے ترجمے میں لکھ دیتے ہیں کہ انھوں نے مغیرہ بن ابی شہاب سے قرآن پڑھا تھا۔ افسوس ہے کہ عبداللہ بن عامر کو صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایسا نہ ملا جو ان کو قرآن پڑھا دیتا۔ انھوں نے قرآن پڑھنے کے لئے چنا بھی تو ایک غیر معروف مجہول الحال ہی شخص کو! اور مغیرہ بن ابی شہاب کے سوا اور کسی سے ان کے قرآن پڑھنے کا کوئی

بھی ذکر نہیں کرتا۔ تیسیر میں ابوعمرو الدانی نے ان کا ایک استاد اور ڈھونڈ نکالا ہے۔ یعنی ابو الدرداء عویمر بن عامر مشہور صحابی رضی اللہ عنہ اور پھر مغیرہ بن ابی شہاب المخزومی کا نام لکھتے ہیں جو ایک مجہول الحال نامعلوم شخص تھے۔ لکھتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قرآن پڑھا تھا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعضوں نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے بذات خود حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا تھا پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ شیخ ابوعلی نے ہمیں خبر دی ہے کہ یہ صحیح ہے کہ عبداللہ بن عامر کا حضرت عثمانؓ سے بذات خود قرآن مجید پڑھنا صحیح ہے۔ مگر یہ شیخ ابوعلی کون ہیں؟ بغیر کسی تصریح کے ان کی شخصیت کس طرح معین کی جائے اور پھر اس کو قاری و مقری بھی ہونا چاہیئے اور ابوعمرو الدانی کا ہمعصر ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ابوعمرو الدانی کو وہ خبر دے سکے۔ کسی نے سچ کہا ہے من جَدَّ وَجَدَ جو ئندہ یابندہ۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد میں نے شیخ ابوعلی صاحب کا پتہ لگالیا۔ اب مجھ سے سنئے۔ ان ابوعلی صاحب کا نام حسن بن قاسم ہے اور ان کا لقب "غلام الہراس" مشہور ہے۔ اہل عراق کے قاری تھے۔ سنہ ۳۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۶۸ھ میں وفات پائی۔ ابوعمرو الدانی کی وفات سنہ ۴۴۴ھ میں ہے اس لئے دونوں میں ملاقات ہوسکتی ہے۔ انہی نے ابوعمرو الدانی سے کہا ہوگا۔ مگر یہ کوئی معتمد علیہ شخص نہ تھے۔ اس لئے پہلے یہ لکھ دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن عامر کا قرآن پڑھنا جو بعض لوگ بیان کرتے ہیں صحیح نہیں ہے اس کے بعد ان کا قول بھی نقل کر دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں صحیح نہیں ہے جب ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے تو حضرت عثمان کی شہادت کے وقت چھبیس ستائیس برس کے ہوں گے۔ تیئس چوبیس برس کی عمر میں ممکن ہے کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا ہو۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ میں ہے اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی وفات ۳۲ھ میں ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو ڈھائی برس پہلے۔ اس لئے اگر یہ عثمان سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے تو پھر حضرت ابوالدرداء سے بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ ان کی عمر زیادہ کرنے کے لئے یہ روایت گھڑی گئی ہے کہ ان کی ولادت ۸ھ میں ہوئی تھی تاکہ حضرت ابوالدرداء اور حضرت

لہ ابن حجر لسان المیزان ج۲ ص۲۵۳ میں ابوعلی غلام الہراس حسن بن قاسم کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ابوالفضل بن خیرون نے ذکر کیا ہے کہ ابوعلی نے قراآتوں میں کچھ خلط ملط کیا ہے اور بعض ایسے اسناد کا دعویٰ کیا ہے جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ اور عجیب عجیب باتیں روایت کی ہیں۔ کسی نے ابی الفضل بن خیرون سے ایک بار ابوعلی غلام الہراس کے بارے میں پوچھا کہ یہ ابوعلی الاہوازی سے روایت کرتے ہیں تو انھوں نے ابی غلام الہراس کے بارے میں کہا کہ یہ سکھایا پڑھایا شخص ہے۔ بڑا جھوٹا ہے ایک بڑے جھوٹے سے روایت کرتا ہے" یعنی ابوعلی غلام الہراس بھی کذاب ہے اور ابوعلی الاہوازی بھی کذاب ہے اور دونوں مشہور قاری ہیں۔ دونوں سے قراآتوں کی روایتیں قرأت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ابوعلی غلام الہراس کے ایک ہی شاگرد ابوالعز القلانسی کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے مگر ان کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ نہ سمعانی، نہ ذہبی کوئی بھی ان کا ذکر نہیں کرتا غرض یہ بھی مجہول الحال ہیں۔ صرف ہبۃ اللہ بن المبارک السقطی نے ان کی بڑی مدح کی ہے مگر سمعانی اور ابن حجر نے لکھا ہے کہ سقطی کے سوا جمہور غلام الہراس ابوعلی کو کچھ اور کہتے ہیں جو سقطی کے قول کے خلاف ہے مگر یہ سقطی صاحب خود غلام الہراس سے زیادہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ابن حجر نے لسان المیزان ج۶ ص۱۸۹ سے ص۱۹۰ تک ان کا مفصل حال لکھ دیا ہے یہ ایسے لوگوں سے اپنی قرأت کی سند جوڑتے تھے جو ان کی پیدائش سے پہلے مرچکے تھے۔ بڑے جھوٹے تھے اسلئے نہ ان کی مدح کا اعتبار نہ ان کی قدح کا۔ اھ تمنا عفرلہ

عثمانؓ سے ان کا قرآن پڑھنا ممکن قرار دیا جا سکے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی ولادت ۲۱ھ میں ہوئی۔ یہ تو کوئی حدیث بھی حضرت ابوالدرداء یا حضرت عثمان یا حضرت علی رضی اللہ عنہم سے روایت نہیں کرتے۔ پورا قرآن ان میں سے کسی سے بھی کس طرح پڑھ سکتے تھے۔ بچپن میں یہ اپنے وطن دمشق میں رہے۔ تابعی تھے۔ متاخرین صحابہ سے حدیثیں روایت کرتے تھے۔ انھوں نے تو حضرت عثمان یا حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کو دیکھا بھی نہ ہوگا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیارت بھی نصیب ہوئی ہوگی۔ تیسیر میں حضرت ابوالدرداء سے ان کے قرآن پڑھنے کا ذکر سند کے لئے کافی نہیں ہو سکتا اور نہ خالد بن یزید بن صالح سے بے سند روایت کہ ان کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی تھی جمہور ائمہ رجال کے خلاف قابل تسلیم ہے۔

ابن عساکر کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ان سے اسمٰعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر نے قرآن پڑھا تھا اور ابو عبیداللہ مسلم بن مشکم نے اور یحییٰ بن الحارث الذماری نے بھی۔ ابن الندیم نے "الفہرست" میں ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن عامر کو بھی ان کا شاگرد لکھا ہے اور سعید بن عبدالعزیز اور ہشام بن عمار اور ثور بن یزید کو بھی۔ ابوعمرو الدانی نے تیسیر ص۵ میں لکھا ہے کہ "قراء سبعہ میں سے ابن عامر الشامی یعنی ابو عبداللہ بن عامر الیحصبی اور ابو عمرو کے سوا کوئی بھی خالص عرب نہیں تھے۔ سب موالی یعنی آزاد کردہ غلام تھے۔" ابوعمرو یعنی ابوعمرو بن العلاء بن عمار بن عبداللہ بن الحصین بن الحارث بن الجلہم بن خزاعی بن مالک بن عمرو بن تمیم۔ ابوعمرو کا نام زبان یا عریان یا یحییٰ بتایا ہے یعنی یہ تمیمی بنی تمیم سے تھے۔ اس لئے عربی تھے۔ ابوعمرو بن العلاء نے ۱۵۴ھ میں کوفہ میں وفات پائی تھی اور عبداللہ بن عامر نے ۱۱۸ھ میں دمشق میں وفات پائی تھی۔ ابوعمرو بن العلاء تو کوفے ہی میں رہتے تھے۔ اہل کوفہ کی صحبت میں رہ کر "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" کے مطابق کوفیوں کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کا مفصل حال آپ پہلے سن چکے۔ عبداللہ بن عامر بہت متقدم ہیں۔ دمشق والوں نے ان کا صرف نام استعمال کیا ہے۔ جہاں تک قیاس رہنمائی کرتا ہے اس کی امید نہیں ہوتی کہ یہ خود اختلافات قرأت کی سازش میں شریک ہوں، خصوصاً جب یہ موالی میں سے بھی نہ تھے۔ خالص عرب تھے۔ جیسا کہ ابوعمرو الدانی نے لکھا ہے۔ مگر ابن السمعانی نے لفظ یحصبی کے تحت میں عبداللہ بن عامر کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یحصب قبیلہ حمیر کی ایک شاخ تھی۔ یہ لوگ حمص میں رہتے تھے۔ بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یحصب ایک قریہ تھا حمص کا۔ سمعانی لکھتے ہیں کہ مگر پہلا ہی قول صحیح ہے۔ ممکن ہے یحصبیون کا قبیلہ حمص کے جس قبیلہ میں رہتا ہو وہ قریہ انھیں کے نام سے مشہور ہو گیا ہو۔ بہرحال نہ یہ قریشی تھے نہ حجاز کے رہنے والے تھے اس لئے ان کو عرب کہدینے سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ غایت سے غایت موالی میں سے نہ تھے یعنی کسی کے غلام آزاد کردہ نہ تھے۔ مگر نہ یہ ضروری ہے کہ جتنے موالی ہوں وہ سب قرآن و اسلام کے خلاف سازش میں شریک ہوں۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ جتنے خالص عرب بلکہ حجازی بلکہ قریشی ہوں وہ سب پکے مومن اور مخلص مسلم ہوں۔ ان کے دلوں میں ملحدانہ خیالات نہیں آ سکتے۔ اچھے برے ہر طبقہ، ہر قبیلے اور ہر جگہ کے لوگ ہر زمانے میں کم و بیش رہے ہیں۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں خاص مدینے والوں میں بھی کچھ منافقین تھے جس کی شہادت خود قرآن مبین دے رہا ہے۔ مختصر یہ کہ سات میں سے صرف دو کے عرب ہونے پر فخر کرنا یا اس کو غلامت سمجھنا صحیح نہیں جب کہ پانچ کے موالی میں سے ہونے کا خود اعتراف ہے۔ پھر بھی میں عبداللہ بن عامر کو اختلاف قرأت کی سازش میں شریک نہیں سمجھتا

ہوں بلکہ سمجھتا ہوں کہ شامیوں نے ان کو اپنی سازش میں شریک کر لیا ہے۔ ان کو بھی نہیں بلکہ ان کے نام کو ان کی وفات کے بعد۔ کیونکہ ان کی وفات کے وقت تک تو کوفے کے خاص خاص گھروں اور خاص خاص محلوں میں اختلافِ قرات کی کھچڑی چپکے چپکے پک رہی تھی۔ اور روایتیں بن رہی تھیں۔ اسناد جوڑے جا رہے تھے۔ الفاظ قرآنی کے اعراب اور نقطے کہیں رسم خط کہیں الفاظ بدل بدل کے لکھے جا رہے تھے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعب وغیرہ رضی اللہ عنہم کے مصاحف مرتب کئے جا رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ غیر منقوط بغیر اعراب کے مصاحف پرانے کاغذات پر لکھے جا رہے تھے جن کی کتابت صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی طرف منسوب کی جا رہی تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ابتداء ہی سے قرآن غیر منقوط بغیر اعراب کے چلا آ رہا ہے۔ غرض ۱۵۰ھ کا زمانہ مختلف قرأتوں کی اشاعت کا نہ تھا بلکہ اشاعت کے لوازمات مہیا کرنے کا تھا۔ باقی رہا صرف قرآن کا پڑھنا یا پڑھانا۔ اس کا تو مدرسہ ہر مسلم گھر میں موجود تھا۔ ہر باپ اپنی اولاد کو، ہر شوہر اپنی بیوی کو اور ہر آقا اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو قرآن پڑھاتا تھا۔ کسی قاری و مقری کی کہیں کوئی ضرورت ہی نہ تھی بجز ان ممالک کے جو فتح ہوتے جا رہے تھے۔ اور جہاں اسلام اس وقت پھیل رہا تھا وہاں کے نومسلموں کے لئے البتہ تعلیم قرآن کے لئے قاریوں اور مقریوں کی ضرورت تھی۔

اچھا اب عبداللہ بن عامر سے جن لوگوں نے اپنا یا دوسروں نے ان کا رشتہ تلمذ جوڑا ہے ان سے بھی کسی قدر تعارف حاصل کر لیجئے تاکہ شامی اسکولِ قرات کا حال بھی آپ کو معلوم ہو جائے۔ مگر پہلے ایک بات سن لیجئے۔

محدثین اور قراء کا تعاون یا ملی بھگت

محدثین میں جامعین صحاح یا امام مالک، امام احمد حنبل اور ان جیسے اکابر محدثین رضی اللہ عنہم اجمعین کی دیانت و خلوص میں ان کی ثقاہت و عدالت میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ائمہ رجال کی تفتیش و تجسس اور دیانتدارانہ تحقیق و تدقیق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ سب حضرات انسان تھے اور انسان کی فطرت میں بھول چوک بھی ہے اور رعایت و مروت بھی ہے، محبت و عداوت بھی ہے اور بہت سی انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔ ان محدثین و ائمہ رجال رحمہم اللہ کو تمام انسانی کمزوریوں سے پاک و منزہ سمجھنا غلط ہی نہیں گناہ بھی ہے اور درحقیقت گناہ کبیرہ ہے۔ محدثین میں جو جامعین سنن ہیں یہ اس زمانے کے لوگ ہیں جب فرقہ بندی مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے فرقہ وارانہ تعصب ان میں نمایاں تھا۔ اکثر محدثین شافعی تھے۔ حنفیوں کے ساتھ ان کا تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ شافعی تھے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے کچھ کھچاؤ سا رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب تاریخ صغیر میں ایک روایت لکھ گئے کہ نعیم بن حماد نے ہم سے بیان کیا کہ ہم سے فزاری نے کہا کہ میں سفیان (ثوری) کے پاس تھا کہ نعمان (امام ابوحنیفہ) کی وفات کی خبر پہنچی۔ تو سفیان نے کہا کہ الحمد للہ! اس شخص نے اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ اسلام میں اس سے زیادہ منحوس آدمی پیدا نہ ہوا۔" (تاریخ صغیر صفحہ ۱۷۴ مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد) حالانکہ نعیم بن حماد کو خود امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الضعفاء الصغیر صفحہ ۲۹ میں ضعیف لکھا ہے اور مشہور شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۱۰ صفحہ ۴۶۳ میں اس نعیم بن حماد کو کذاب لکھتے ہیں اور صاف طور سے تحریر فرماتے ہیں۔ دو دو جگہ صفحہ ۴۶۲ میں

بھی اور ص۳۱۷ میں بھی کہ کان یضع الحدیث فی تقویۃ السنۃ وحکایات فی ثلب ابی حنیفۃ کلھا کذب یعنی نعیم بن حماد سنت کی تقویت کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور امام ابوحنیفہ کی تنقیص میں حکایتیں گھڑا کرتے تھے اور وہ سب جھوٹی ہوتی تھیں۔ اور فزاری صاحب جن کا نام مروان بن معاویہ ہے وہ بھی نعیم بن حماد سے کچھ کم نہ تھے مجہول لوگوں سے غلط سلط روایتیں کرتے تھے۔ اور کبھی راویوں کے نام بھی بدل دیتے تھے اس لئے ان کے معروف و مجہول دونوں قسم کے شیوخ مشتبہ ہی حال میں رہتے تھے۔ چنانچہ ابن حجر تہذیب التہذیب ج۱ ص۱۶۱ میں لکھتے ہیں کہ یہ ابراہیم بن محمد سے روایت کرتے تھے مگر نام بدل کے یعنی ابراہیم کو عبدالوہاب قرار دے کر۔ مگر ج۱ ص۹۸ میں ان کے اوصافِ حسنہ کی تصریح کی ہے۔ غرض ائمہ حدیث ہوں یا ائمہ رجال کمزوریوں سے وہ بری نہ تھے۔ وہ ان قاریوں کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ رہے تھے اور ایک حد تک سمجھتے بھی تھے۔ مگر سازشیوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود ان کے ساتھ بھی محدثین کی جماعت بن کر لگی ہوئی تھی۔ جن میں سے کچھ ان کے تلامذہ تھے تو کچھ ان کے شیوخ و اساتذہ بھی تھے۔ کچھ ان کے کاتب اور وراق (دفتری) تھے تو کچھ دوست احباب بھی تھے اور وہ سب قاریوں کے حامی تھے۔ اس لئے ان قاریوں کے خلاف کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ بلکہ اختلاف قرأت کی کچھ روایتیں اپنی کتابوں میں لکھ لینے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔ اور اگر وہ جامعین خود اپنی کتابوں میں اسی قسم کی روایتیں درج نہیں کرتے تھے تو ان کے کاتب ان کے وراق جن میں اکثریت سازشی ہی لوگوں کی تھی اور ان کے سازشی تلامذہ ان کے بعد ان کی کتابوں میں داخل کر کے ان کتابوں کی متعدد نقلیں کر کے مختلف جگہ پھیلا دیتے تھے۔ تاکہ وہی سازشی نسخہ کثیر الاشاعت ثابت ہو کر صحیح سمجھا جائے۔ جن کے پاس اصل نسخے کی صحیح نقل ہو بھی تو وہ اپنی کتاب میں ان حدیثوں کی کمی سمجھ کر ان کو اپنی کتابوں میں داخل کر لیں۔ اگر محدثین قاریوں کی ان ریشہ دوانیوں کو اچھی نظر سے دیکھتے تو وہ خود حدیث سے زیادہ اختلافِ قرأتِ قرآن میں اس سرگرمی سے حصہ لیتے جس سرگرمی سے قاریوں کی جماعت حصہ لے رہی تھی۔ ورنہ ان محدثین کا تعلق ان قراء سبعہ کے ساتوں اسکولوں سے کیوں نہ ہوا؟ ان لوگوں نے ان اسکولوں میں سے کسی اسکول میں کیوں قرآن نہیں پڑھا؟ محدثین سے تو ایک دنیا آباد نظر آتی ہے اور قاریوں کو انگلیوں پر گن لیا جا سکتا ہے؟ کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو دو ایک سے زیادہ اسٹوڈنٹ نہیں ملے۔ ادھر ادھر سے مانگے کے شاگرد و جانشین بنا لئے جاتے رہے۔ یہ افلاس ان قاریوں میں آخر کیوں تھا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ علمی طور سے مخلص مسلمانوں کو ان کی یہ ریشہ دوانیاں کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ ابتدا میں جب تک سازش کو سازش نہیں سمجھے تھے انزل القرآن علی سبعۃ احرف والی حدیث اور بعض اختلافِ قرأت کی روایتیں لکھی تھیں یا انکی کتابوں میں داخل کر دی گئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بعد والے محدثین اور عامہ مسلمین ان کو صحیح سمجھ کر چپ تھے اور ان حدیثوں کو احادیثِ متشابہات سمجھ کر ان پر ایمان رکھتے تھے مگر جب اختلافاتِ قرأت کا انبار لگنے لگا تو محدثین اور ان کے ساتھ عام مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ان سے الگ تھلگ ہی رہی۔

ائمہ رجال بعض قاریوں کے حالات سے واقف نہ تھے تو دوسرے قاریوں سے پوچھ لیا کرتے تھے جو کچھ وہ بتا دیتے تھے یہ لکھ لیا کرتے تھے۔ دروغگو را حافظہ نباشد بات اگر سچ ہو تو جس سے بھی پوچھئے سب ایک ہی بات کہیں گے۔ مگر جھوٹی بات میں ضرور اختلاف

ہوگا۔ اس لئے کسی نے کسی کو کسی کا شاگرد لکھوا دیا۔ کسی نے کسی کا۔ کسی نے کسی کو کسی کا شاگرد لکھوایا دوسرے نے اس کا الٹ لکھوا دیا۔ کہ وہ ان کا شاگرد تھے اور یہ استاد تھے۔ ان باتوں کو ذہن نشین رکھتے ہوئے اب سنئے۔

اسمٰعیل بن عبید اللہ بن ابی المہاجر کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب ج۵ ص۲۷۴ ترجمہ عبداللہ بن عامر بن یزید الیحصبی المقری الدمشقی میں لکھتے ہیں قرأ علیہ اسمٰعیل بن عبید اللہ بن ابی المھاجر و ابو عبید اللہ مسلم بن مشکم و یحیٰی بن الحارث الذماری۔ ان کے ترجمے میں اس سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ اسمٰعیل بن عبد اللہ بن ابی المہاجر شاگرد تھے اور عبداللہ بن عامر استاد۔ مگر ج۱ ص۳۱۶ ترجمہ اسمٰعیل بن عبید اللہ بن ابی المہاجر المخزومی جو مخزومیوں کے غلام آزاد کردہ تھے۔ مگر ان کو قاری لکھا ہے نہ مقری۔ نہ یہ قرأت کے فن میں کسی کے استاد تھے نہ شاگرد۔ اور حضرت انسؓ جیسے متعدد صحابہ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اگر ان کو قرآن پڑھنا ہی تھا تو صحابہ کو چھوڑ کر ایک دمشقی سے جس سے قرآن پڑھنے کی انھیں کیا ضرورت تھی۔ اگرچہ یہ خود بھی دمشقی ہی تھے۔ بس صرف دونوں کو دمشقی دیکھ کر جو سن میں کم تھا اس کو شاگرد اور بڑے کو استاد قرار دے کر سلسلہ جوڑ دیا۔ حالانکہ یہ نہ عبداللہ بن عامر سے کوئی حدیث بھی روایت نہیں کرتے۔

اور سنئے تہذیب التہذیب ج۷ ص۲۲۵ عطیہ بن قیس الکلابی الدمشقی جو بنی عامر کے غلام آزاد کردہ تھے ان کے ترجمے میں ابن حجر لکھتے ہیں بروایت عبدالواحد بن قیس (جو عروہ بن الزبیر یا عمرو بن عتبہ کے غلام آزاد کردہ تھے) کہ لوگ اپنے مصاحف کو عطیہ بن قیس کی قرأت کے مطابق درست کر لیا کرتے تھے: یعنی عطیہ اس قدر مسلم الثبوت قاری تھے کہ لوگوں کو اپنے مصاحف پر جو بقول قرآن مصحف عثمانی ہی ہوگا یا شاید مصحف عبداللہ بن مسعود یا مصحف ابی بن کعب کے مطابق۔ لیکن ان میں سے کسی مصحف پر لوگوں کو اعتماد باقی نہ رہا تھا جو قرأت عطیہ بن قیس نے اختیار کی تھی، وہی قرأت سارے اہل دمشق کو بقول عبدالواحد بن قیس پسند آگئی تھی۔ مگر خود عطیہ نے یہ قرأت جو دمشق میں اس قدر مقبول تھی کس سے حاصل کی تھی اس کا مطلق ذکر نہیں۔ حدیثیں یہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرتے تھے ان کا ذکر ضرور ہے۔ ان سے قرآن پڑھنے کا ذکر نہیں تو پھر ان کا وہ کون سا مصحف تھا کہ سارے دمشقیوں نے ان کے مصحف پر اپنے مصاحف کو قربان کر دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ عبدالواحد صاحب کی دروغ بافی اور اپنی پارٹی کے آدمی کا پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں۔ عبدالواحد بھی دمشقی اور عطیہ بھی دمشقی۔ عطیہ بھی ایک آزاد کردہ غلام اور عبدالواحد بھی آزاد کردہ غلام۔ اسلئے اگر یہ سازش قرأت کے ارکان کا پروپیگنڈہ کریں تو کیا بعید از عقل ہے۔ اور یہ عبدالواحد تھے بھی ایسے ہی کہ عجیب عجیب حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ مشہور محدثین سے منکر حدیثیں "حدثنا" کہہ کر روایت کرتے تھے حضرت ابوہریرہؓ کو دیکھا تک نہ تھا مگر ان سے بے محابا روایت کیا کرتے تھے۔ اسی لئے محدثین نے ان کو متروک الحدیث لکھا ہے۔ تو پھر ان سے اپنی سازشی پارٹی کا جھوٹا پروپیگنڈہ کیا بعید از عقل ہے؟

ادارہ کا لٹریچر اور ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری کتابوں کے لئے مکتبہ طلوع اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور کو تحریر فرمائیے

نقد و نظر

THE QUIET REVOLUTION

انگریزی ہفتہ وار جریدہ اسٹار کے مدیر عزیز بیگ صاحب کی کتاب "اسیر کشمیر" (CAPTIVE KASHMIR) پر تبصرہ ان صفحات پر پہلے آچکا ہے اب ان کی دوسری کتاب (THE QUIET REVOLUTION) — انقلابِ خاموش — ہمارے زیرِ نظر ہے۔ نام کے اعتبار سے تو کتاب کا موضوع سنہ ۱۹۵۸ء کا عسکری انقلاب ہے۔ لیکن یہ درحقیقت غدر کے بعد سے تشکیلِ پاکستان تک ہماری جنگِ آزادی کی داستان اور قیامِ پاکستان سے لے کر اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء تک ہماری تباہیوں کی الم انگیز روئداد کا مرقع ہے۔ عسکری انقلاب سے متعلق (اس ۲۷۰ صفحات کی کتاب میں) صرف دس صفحات ہیں۔ اس کے بعد مختصر الفاظ میں مملکت کے موجودہ سربراہوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ جن سابقہ خرابیوں کی وجہ سے ہماری سابقہ حکومتیں ناکام اور بدنام ہوتی تھیں انھیں خاص طور پر نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ عزیز صاحب کے قلم میں جوش اور روانی دونوں دوش بدوش رہتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بیک وقت مشری بھی دکھائی دیتے ہیں اور وقائع نگار بھی یہی خصوصیات اس کتاب میں بھی ہیں۔ جنگِ آزادی کی تاریخ کے اعتبار سے اس میں کافی معلومات ہیں (اور رہی سہی کمی ضمیمہ جات نے پوری کر دی ہے) اور سابقہ حکومتوں پر تنقید کے لحاظ سے گہری نشتریت۔ جی چاہتا تھا کہ وہ عسکری انقلاب کے متعلق زیادہ تفصیل سے لکھتے۔ جس عظیم واقعہ نے ہماری تاریخ میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کیا ہے، مملکت کے سامنے اس کی زیادہ تفاصیل آنی چاہئیں۔

کتاب میں ایک کمی بھی نظر آتی ہے۔ بہت سے اقتباسات ایسے ہیں جن کے حوالے نہیں دیئے گئے۔ ان حوالوں کا ہونا ضروری تھا۔

کتاب موٹے کاغذ پر عمدہ انداز سے چھاپی گئی ہے اور دس روپے میں (PAKISTAN PATRIOTIC — PUBLICATIONS) — وُڈ اسٹریٹ۔ کراچی سے مل سکتی ہے۔

احباب سے درخواست

"احباب طلوع اسلام سے کوئی دوست طلوع اسلام سنہ ۵۳ء، سنہ ۵۰ء، سنہ ۴۹ء، سنہ ۴۸ء کا کوئی پرچہ بھیج سکے تو پتہ ذیل پر مطلع فرمایا جائے۔" "ملک حنیف وجدانی۔ موہڑہ سیداں۔ مری"

حقائق و عبر

۱۔ ایک زبردست دلیل

اس عنوان سے، ۲۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کے الاعتصام میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"علم و حکمت کی رُو سے اس سال کا یہ اہم واقعہ ہے کہ روس کا کائناتی راکٹ چاند کی دُنیا میں داخل ہو گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ ڈھائی لاکھ میل ہے جو روسی راکٹ نے ۳۳ گھنٹے میں طے کیا۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ راکٹ کے چاند میں اترنے سے قبل ایک کالا دھبہ نمودار ہوا جو بعد میں کئی کالے دھبوں میں بدل گیا یہ دھبے راکٹ کے چاند میں اترنے کے بعد ایک گھنٹہ تک نظر آتے رہے۔

روس کے اس سائنسی کارنامے نے ساری دنیا کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا ہے۔ اور مختلف نقطۂ فکر کے لوگوں کے سامنے غور و فکر کے مختلف دروازے کھول دیئے ہیں۔ روس اور اس کے حلیف اس پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کے حریف مثلاً امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ ممالک اس پر شرما بھی رہے ہیں اور ایک قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں لیکن بحیثیت مجموعی پوری دنیا اس سے متاثر ہے اور اس کا اور اس کے نتائج کا گہری نگاہ سے مطالعہ کر رہی ہے۔

یہ اس ذکر کا واقعی ایک کارنامہ اور سائنسی فتوحات کا حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ سرزمین عرب کی ایک شخصیت چودہ سو برس ہوئے کہ چاند سے بھی آگے نکل گئی تھی اور ایک ہی رات میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصیٰ اور پھر زمین و آسمان کے درمیانی فاصلوں کو ناپتی ہوئی انتہائی بلندیوں تک پرواز کر گئی تھی اور وہ تھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سب نہ زمین کا قانونِ کشش ثقل آپ کے راستہ میں مزاحم ہو سکا اور نہ گرم و سرد کُرے آپ کی رفتارِ پرواز پر اثر انداز ہو سکے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں روسی راکٹ نے ڈھائی لاکھ میل کا سفر ۳۳ گھنٹے میں طے کیا ہے تو اس زمانہ میں جب کہ علم و حکمت کی اس اسلوب سے ابھی صبح بھی طلوع نہیں

ہوئی تھی، اللہ کے اس ۔۔۔ عبدہ نے صرف ایک رات میں اس سے بھی زیادہ سفر کر لیا تھا۔

سائنس کا یہ موجودہ کارنامہ ہمارے لئے ہرگز باعث حیرت و تعجب نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کی صداقت پر ایک زبردست دلیل ہے۔

اگر انسانی علم اتنی ترقی کر سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا راکٹ چاند اور سورج کی دنیا میں داخل ہو سکے تو اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت میں کیوں اتنی طاقت نہیں ہو سکتی کہ اپنے ایک برگزیدہ پیغمبر کو ایک ہی شب میں ہفت افلاک کی سیر کرا دے اور وہاں کے واقعات آپ پر منکشف کر دے۔"

کس قدر مقام تاسف ہے کہ یہ حضرات اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جس چیز کے متعلق یہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کی صداقت کی زبردست دلیل ہے، اس سے غیروں کی نظروں میں اسلام کیا بن کر رہ جاتا ہے! راکٹ کا چاند تک پہنچ جانا یا اس سے بھی آگے نکل جانا، مادی ذرائع سے ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ بہ جسد مبارک عالم افلاک کی سیر کے لئے تشریف لے گئے تھے تو اس کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ایسا مادی ذرائع سے ہوا تھا۔ لہذا جو بات مادی ذرائع (اور صرف مادی ذرائع) سے ممکن ہوئی ہو، اسے کسی ایسی بات کی "زبردست دلیل" قرار دینا جس میں مادی ذرائع کا کوئی واسطہ نہ ہو، علم کی دنیا میں موجب خفت ہوگا۔

اس مقام پر اتنا عرض کر دینا غیر از محل نہ ہوگا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ عالم بالا پر بہ جسد مبارک تشریف نہیں لے گئے تھے (اور خود صحابہ کبار میں ایسے حضرات موجود تھے جو جسمانی معراج کے قائل نہ تھے۔ ابن کثیر) انہیں خدا کی قدرت سے انکار نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضورؐ بہ جسد عنصری آسمانوں پر تشریف لے جا کر اللہ تعالیٰ سے ملے تھے تو اس سے یہ ماننا لازم آجائے گا کہ خدا کسی خاص مقام پر مقیم ہے۔ ذات خداوندی کے متعلق ایسا تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ خدا مکان اور زمان کی نسبتوں سے بلند ہے وہ تو ہر انسان سے اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے اور جہاں کوئی ہو وہیں اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

حج کا فلسفہ

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ذکر ان صفحات میں اس سے پہلے کئی بار آچکا ہے۔ وہ یورپ میں بیٹھے "اسلام" کی تبلیغ کرتے ہیں۔ کراچی کے ہفتہ وار اخبار "الاسلام" (بابت یکم جولائی ۱۹۵۹ء) میں ان کا ایک مضمون درج ہے جس میں حج کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں آپ فرماتے ہیں۔

> جنت سے نکلنے کے بعد (حضرت) آدم اور (اماں) حوا ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ (مدتوں) ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہے اور بالآخر خدا کی رحمت سے عرفات کے میدان میں ان کی ملاقات ہو گئی۔ خدا کے اس احسان کے شکریہ کے لئے، آدم و حوا کی اولاد، خدا کی طرف رجوع کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اپنے آپ کو بھلا کر بحضور باری تعالیٰ جذب ہو جائیں اور خدا سے اپنی سابقہ لغزشوں کی معافی مانگیں اور آئندہ کے لئے اس کی تائید و نصرت کی التجا کریں۔ (ترجمہ از انگریزی)

یہ تو رہا اجتماعِ عرفات کا فلسفہ۔ "رمی الجمار" (پتھر مارنے) کے متعلق ارشاد ہے۔

> جب (حضرت) ابراہیمؑ نے یہ دعویٰ کیا کہ انھیں خدا کی محبت ہر شے سے بڑھ کر ہے تو اس کے ثبوت میں خدا نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کردے۔ (یہی آزمائش کچھ کم نہ تھی) اس پر طرہ یہ کہ شیطان تین مرتبہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچا تاکہ انھیں اس قربانی سے باز رکھ سکے۔ کہتے ہیں کہ واقعہ منیٰ میں ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے ہر مرتبہ شیطان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ لہٰذا ہر حاجی 'سنتِ ابراہیمیؑ' کے اتباع میں استعارۃً شیطان کو پتھر مارتا ہے تاکہ وہ اس کے وساوس سے محفوظ رہے۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے ہاں کے ایک "ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی" اہلِ مغرب کے سامنے اسلام کا فلسفہ کس انداز میں پیش فرما رہے ہیں؟۔ واضح رہے کہ قرآن میں نہ (حضرت) آدم اور (اماں) حوّا کے بچھڑنے اور ملنے کا تذکرہ ہے اور نہ ہی حضرت ابراہیمؑ کے شیطان کو پتھر مارنے کا ذکر۔

۳۔ سچّی باتیں

محترم عبدالماجد صاحب اپنے ہفت روزہ جریدہ 'صدقِ جدید' (لکھنؤ) کی ۱۰ر اگست کی اشاعت میں لکھتے ہیں کہ گجرات (بھارت) کے ایک علاقہ میں ایک مستقل مذہبی ادارہ قائم ہوا ہے جو شری نہرو کو اوتار مانتا ہے اور ان کی پوجا کرتا ہے۔ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالماجد صاحب رقمطراز ہیں۔

> لیکن سنجیدگی سے سوچئے تو اس سے ایک بڑا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے اور پچھلے مشہور اوتاروں کرشن جی، رام چندر جی کی طرف سے بڑی صفائی پیش ہو جاتی ہے۔ جب یہ تاج آج دور روشن میں جواہر لال جیسے شخص کے سر پر زبردستی رکھ دیا گیا جو سرے سے اس منصب ہی کے قائل نہیں، اور نہ کسی نئے اوتار کے ماننے والے ہیں نہ پرانے کے۔ تو آج سے ہزار ہا سال قبل اگر اس دور کے مقدس ترین فرزندوں اور ملک و قوم کے بہترین مصلحوں اور مخلصوں کی جانب بیشمار مبالغہ آمیز اور بے بنیاد روایتیں منسوب کر دی گئی ہوں تو اس پر حیرت کس درجے میں بھی کیوں ہو؟ وہ لاکھ توحید کا دم بھرنے والے ہوں۔ توحید کا پرچار کرنے والے ہوں۔ لیکن یاروں کو چین کب آتا ہے، جب تک ابراہیمؑ کو آزر کا لباس نہ پہنا دیا جائے اور خود بت شکن کو بت نہ بنا دیا جائے۔ اور ہندوؤں کو کیا کہا جائے۔ پاکیزہ شخصیتوں کی پاکیزہ تعلیمات پر پردہ ڈال دینے، اور انھیں بالکل مسخ کر ڈالنے میں مسلمانوں کا قدم کیا کچھ اُن سے بہت پیچھے رہ گیا ہے؟ بندگی اب خود ہمارے ہاں بھی بجز ایک مجموعۂ خوارق و عجائب کے اور کیا رہ گئی ہے؟

محترم عبدالماجد صاحب نے بات بالکل سچی بات کہی ہے لیکن عملاً خود ان حضرات کا کیا حال ہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو آپ کسی ایسے بزرگ کے خوارق و عجائب کا انکار کر دیجئے جنھیں عبدالماجد صاحب "ولی اللہ" مانتے ہوں پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح بچے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں! یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی 'سچی باتوں' کا لوگوں پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔

جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ تھی اب تک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار
(اقبال)

دورِ حاضرہ کی عظیم تصنیف

نظامِ ربوبیت

از ——— پرویز

نے اسی حقیقت کو اس دور میں بے نقاب کیا ہے ——— !!!

اِس کتاب سے آپ دیکھیں گے کہ نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کس طرح انسانی مشکلات کا حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اور ان کی جگہ قرآن کا معاشی نظام کس طرح آدم کو اس کے فرد میں گم گشتہ تک پہنچا دیتا ہے۔

اِس کی اصلی قیمت چھ روپے ہے لیکن ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء تک صرف

چار روپے

میں مل سکتی ہے (محصول ڈاک علاوہ)

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷/بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

رابطہ باہمی

راولپنڈی کا اجتماع راولپنڈی (الکوثر) میں ۳ اکتوبر کی صبح ہی سے نمائندگان کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ایک بجے کے قریب محترم پرویز صاحب بھی (بذریعہ ہوائی جہاز) تشریف لے آئے۔ لاہور سے ان کے رفقاء (چوہدری عبدالرحمٰن صاحب، نظامی صاحب اور ڈاکٹر احمد حسن صاحب۔ صمد دین صاحب۔ خالد قریشی صاحب) پہلے پہونچ چکے تھے۔ ناظم ادارہ محترم عبدالرب صاحب ادارہ کی مصروفیات کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے جس کا شرکائے اجتماع کو افسوس رہا۔ غیر رسمی اجتماعات اسی وقت سے شروع ہو گئے تھے۔

۲½ بجے شام، ڈان ہوٹل کے وسیع سبزہ زار میں خطاب عام کا انتظام کیا گیا تھا۔ شرکت اگرچہ دعوت ناموں کے ذریعہ تھی۔ لیکن مدعوئین کے علاوہ، بہت سے حضرات از خود شریک اجتماع ہو گئے اور میدان کی وسعت حاضرین پر تنگ ہو گئی۔ محترم مرزا خلیل احمد صاحب نے تلاوت قرآن کریم کے بعد علامہ اقبالؒ کی نظم

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے

نہایت جذب و سوز سے سنائی۔ محترم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب (صدر کنونشن کمیٹی) فرائض صدارت انجام دے رہے تھے۔ اس کے بعد محترم پرویز صاحب نے "اسلامک آئیڈیالوجی" کے عنوان پر تقریر شروع کی۔ فضا کے سکوت اور سامعین کے جذب کی یہ کیفیت تھی کہ قریباً سوا گھنٹے کی تقریر کے دوران کسی کے کھانسنے کی آواز تک بھی سنائی نہ دی۔ اپنی تقریر میں فاضل مقرر نے اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کیا کہ کوئی ایسا نظام، آئین یا قانون اسلامی نہیں کہلا سکتا جس کی بنیاد قرآن کریم کی مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں پر نہ ہو۔ آخر میں جب انھوں نے فرمایا کہ صحیح اسلامی آئین کی تدوین کے بارے میں انھیں، ملک کے موجودہ سربراہوں کی نیت نیک اور ارادے مخلص نظر آتے ہیں تو سامعین کے قلوب میں حسین امیدوں کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ تقریر کے خاتمے پر جب صاحب صدر نے کہا کہ اگر کسی صاحب کو کوئی سوال کرنا ہو تو مقرر اس کا جواب دینے کے لئے تیار ہیں تو کسی نے ایک سوال بھی نہ پوچھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریر ایسی صاف، واضح اور مدلل تھی کہ اس کے بعد کسی مزید وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ حالات کا مطالعہ کرنے والے حضرات کی رائے ہے کہ راولپنڈی میں اس قسم کا اجتماع اس سے پیشتر بہت کم دیکھنے میں آیا ہو گا۔

نماز عشاء کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر الکوثر کے وسیع صحن میں چارپائیاں بچھا دی گئیں۔ کیونکہ اجتماع نمائندگان کی کارروائی کے متعلق فیصلہ تھا کہ وہ ہفتہ کی صبح کو کی جائے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ پرویز صاحب تشریف فرما ہوں اور بزموں کے نمائندگان ارد گرد حلقہ بند، تو پھر صبح تک کا انتظار کون کر سکتا ہے؟ چنانچہ سلسلہ کلام اسی وقت شروع ہو گیا اور نصف شب سے تک فکر قرآنی کی نشر و اشاعت کے بہت سے گوشے نکھر کر سامنے آتے چلے گئے۔

ہفتہ کی صبح نماز اور ناشتہ سے فارغ ہو کر نمائندگان کے اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہوئی۔ شرکاء اجتماع کے اسمائے گرامی درج فہرست ہیں۔ کارروائی رسمی ہونے کی بجائے بالکل ایسی تھی جیسے ایک خاندان کے افراد اپنے معاملات پر مشاورتی گفتگو کر رہے ہوں۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے موثر اقدامات کیا ہونے چاہئیں۔ یہ تھا مرکزی لفظ جس کے گرد تجاویز اور ان پر بحث و نظر کا سلسلہ گھومتا تھا۔ باہمی افہام و تفہیم کے ماحول میں ایک ایک تجویز طے ہوتی گئی جسے نمائندگان اپنی اپنی بزموں تک پہنچانے کے لئے اپنے ساتھ لے گئے۔ بارہ بجے کے قریب یہ کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔

کھانے کے بعد الوداعی نشست منعقد ہوئی جس میں محترم پرویز صاحب نے اثر و درد میں ڈوبے ہوئے انداز سے اپنے رفقائے کار کو مناسب ہدایات دیں جن میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں کوئی ذریعہ ایسا اختیار کیا جائے جو قرآن کی رُو سے ناجائز ہو۔ جھوٹ بولنا تو بجائے خود مبالغہ تک سے بھی اجتناب کیا جائے۔ فریب دینا تو کجا، محض جذبات کو اپیل کر کے بھی کسی کو اپنی طرف لانے کی کوشش نہ کی جائے۔ قرآن کریم کی تعلیم نہایت واضح۔ صاف اور بے لوث انداز میں پیش کرنے کے بعد دوسروں کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے اور جو علیٰ وجہ البصیرت آپ سے تعاون کے لئے آمادہ ہو، اسے ہم سفر بنا لیا جائے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی رفتار کو تیز تر کرنے کے سلسلہ میں سب سے بڑا سوال فنڈز کا تھا۔ اس ضمن میں محترم پرویز صاحب نے اس حقیقت کو پھر دہرایا کہ ادارہ کا ذریعہ آمدنی کتابوں کی فروخت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ اس سے بمشکل ادارہ کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ اس لئے نشر و اشاعت کے اخراجات ہر بزم کو خود ہی پورے کرنے ہوں گے۔ اس لئے یہ تمام ذمہ داری ارکان بزم پر عائد ہوتی۔ وہ اپنے ذرائع کو دیکھ کر فیصلہ کریں کہ اس باب میں زیادہ سے زیادہ کتنا ایثار کر سکتے ہیں۔ اسی کے مطابق ہر بزم اپنا بجٹ بنائے۔ ہمیں کسی سے امداد کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔

اس کے بعد بزم راولپنڈی کے اراکین اور ان کے نمائندہ محترم فیروز علی بھٹی صاحب کے حسنِ انتظام اور مہمان نوازی کا دلی شکریہ ادا کیا گیا۔ اور حسین تمناؤں اور مخلص دعاؤں کے بعد اس اجتماع کی کارروائی ختم ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

فہرست شرکاء اجتماع

ضلع لاہور

خاص	چوہدری عبدالرحمن صاحب	خاص	محمد خالد قریشی صاحب
"	مرزا احمد خلیل صاحب	"	عبداللطیف نظامی صاحب
		"	ڈاکٹر احمد حسن صاحب

خاص — محمد دین صاحب

(قصور) — مسعود حسن صاحب

ضلع لائلپور

خاص — خان محمد اکرم خاں صاحب

(چک ۱۹۹گ.ب) — صوبیدار یوسف علی صاحب

(سمندری) — چوہدری نذیر احمد صاحب

(گوجرہ) — عبداللہ خاں صاحب امرتسری

ضلع راولپنڈی

خاص — محمد آصف حسین صاحب

" — ظہور الحق صاحب

" — ایم یوسف سرحدی صاحب

" — منظور حسین صاحب

" — مولا بخش صاحب

" — فیروز علی بھٹی صاحب

" — غلام حسین صاحب

(مری) — ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب

" — مضطر عباسی صاحب

" — ملک حنیف وجدانی صاحب

(واہ کینٹ) — نذیر اللہ خاں نیازی صاحب

مردان

خاص — ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب

" — ڈاکٹر رضا محمد خاں صاحب

پشاور

خاص — مرزا علی احمد خاں صاحب

" — یوسف ضیاء صاحب

خاص — صلاح الدین صاحب

گوجرانوالہ

خاص — خواجہ محمد حسین صاحب

" — شیخ محمد اقبال صاحب

کراچی

خاص — محمد سعید صاحب

" — گلزار حسین صاحب

ضلع ملتان

(دنیاپور کسی) — عطا محمد علوی صاحب

ضلع سرگودھا

(چک ۴۱ شمالی) — چوہدری نصر اللہ خاں صاحب

ضلع گجرات

(جلالپور جٹاں) — میر علاء الدین صدیقی صاحب

ضلع جہلم

(پنڈ سید حسین) — سید امیر حسین شاہ صاحب

" — سید محمد حسین شاہ صاحب

(پنڈ دادنخاں) — عبدالرحیم خاں صاحب

ضلع شیخوپورہ

خاص — غلام جیلانی صاحب

(ننکانہ) — عبدالکریم صاحب

ضلع جھنگ

(چنیوٹ) — شیخ محمد اقبال صاحب

خاص — نور محمد صاحب

ضلع حیدرآباد

(ٹنڈو محمد خاں) — ہر حافظ شاہ صاحب ایڈووکیٹ

(ٹنڈو آدم) — مولانا محمد خلیل صاحب

دورہ کیمبلپور و پشاور

محترم پرویز صاحب مع رفقاء ۱۱ اکتوبر کو لاہور سے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ راولپنڈی میں مختصر سا قیام کیا اور وہاں خواتین کے ایک مجمع سے عورت کے حقوق پر خطاب کرنے کے بعد آگے روانہ ہو گئے۔ قبل مغرب کیمبلپور پہنچے اور مقامی ڈاک بنگلے میں فروکش ہوئے۔ محترم غلام جیلانی برق صاحب، پروفیسر محمد عثمان صاحب مرید حسین قریشی صاحب ڈی ایس پی۔ متعدد طلبائے کالج اور ان کے پروفیسر اسلامیات نے استقبال کیا۔ راولپنڈی اور پشاور سے بھی متعدد احباب تشریف لے آئے تھے۔

بعد مغرب مقامی گورنمنٹ کالج کے وسیع صحن میں جلسہ کا انتظام تھا۔ جلسہ گاہ سامعین سے پُر تھی۔ پرنسپل صاحب نے بحیثیت صدر جلسہ فاضل مقرر کا تفصیلی تعارف کرایا اور ازاں بعد پرویز صاحب نے ڈیڑھ گھنٹہ تک اسلامک آئیڈیالوجی کے عنوان پر تقریر کی۔ تقریر نہایت سکون اور دلچسپی سے سُنی گئی۔ خاتمہ پر چند حضرات نے سوالات کئے جن کے جوابات پرویز صاحب نے وضاحت سے دیئے اور پھر جلسہ برخاست ہو گیا۔ بحیثیت مجموعی کیمبلپور کی فضا پر تقریر کا نہایت خوشگوار اثر ہوا۔

رات کے کھانے کا انتظام جناب ہمدردی صاحب نے اپنے دولت کدہ پر کیا تھا جس میں متعدد مقامی ارباب فکر و نظر شریک ہوئے۔ اگلی صبح ناشتہ جناب مرید حسین قریشی صاحب کے مکان پر ہوا۔ وہاں بھی کوئی ایک درجن اصحاب تشریف لائے تھے۔ ناشتہ کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک مختلف امورِ قرآنی پر گفتگو ہوتی رہی۔ فارغ ہو کر پرویز صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے اور وہاں طلبائے کالج سے ملاقات فرمائی جو دس بجے تک جاری رہی۔ پھر پشاور کا رُخ کیا گیا۔

۱۵ اکتوبر کو دوپہر کے وقت پشاور پہنچے۔ قیام مرزا علی احمد صاحب انجینئر کے مہمان بزم طلوع اسلام کے دولت کدہ پر ہوا۔ آنے جانے والوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ان میں مقامی حضرات کے علاوہ مردان۔ نوشکی۔ ہنگو۔ کوہاٹ۔ جمرود وغیرہ کے بہت سے احباب شامل تھے۔

بعد مغرب جلسہ کا انتظام گورنمنٹ ہائی اسکول کے وسیع و عریض صحن میں بزم پشاور نے کیا تھا۔ جلسہ گاہ بہت جلد سامعین سے بھر گئی۔ بزم نے پرویز صاحب کا تعارف تقسیم کرنے کے خیال سے چھاپ لیا تھا۔ صدر جلسہ (چوہدری عبدالرحمٰن صاحب) نے اسے پڑھا اور ازاں بعد موصوف نے اسلامک آئیڈیالوجی پر تقریر شروع کی۔ تقریر نہایت سکون اور دلچسپی سے سنی گئی۔ جلسہ کے برخاست ہونے سے قبل اعلان کیا گیا کہ آئندہ شام اسی مقام پر ساڑھے چھ بجے پرویز صاحب "مقام محمدیؐ" کے عنوان پر خطاب فرمائینگے۔

دوسرے جلسہ میں سامعین کی تعداد نمایاں طور پر زیادہ تھی۔ ابتداء میں صدر جلسہ (خان بخت جمال خاں صاحب) نے مقرر کا تعارف پشتو زبان میں کرایا۔ یہ تعارف بلیغ اور پُر جوش تھا۔ ازاں بعد پرویز صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ جلسہ گاہ میں کامل سکوت تھا۔ سانس کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ لیکن بہت سی آنکھیں پُر نم تھیں۔ تقریر کے بعد حاضرین نے پرویز صاحب سے مصافحہ کا تانتا باندھ دیا۔ پشاور کے دونوں جلسے نہایت کامیاب رہے۔

کیمبلپور اور پشاور کے جلسوں میں خواتین معتدبہ تعداد میں شریک ہوئیں۔ راولپنڈی اور پشاور کی خواتین نے پرویز صاحب

سے دوبارہ تشریف لانے کا وعدہ لے لیا ہے۔

۱۷ اکتوبر کی صبح، پرویز صاحب مع رفقاء بذریعہ طیارہ واپس لاہور تشریف لے آئے۔ اس دورہ سے قرآنی فکر دور دراز گوشوں تک پھیل گیا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

ادارہ طلوع اسلام ان تمام احباب کا بدل شکر گزار ہے جنھوں نے ان اجتماعات کو کامیاب بنانے میں کوشش فرمائی۔ اور مہمانوں کی تواضع سے اپنی مسافر نوازیوں کا ثبوت دیا۔

رپورٹیں

ڈنڈوت (ضلع جہلم)

بزم کی تشکیل کے سلسلے میں احباب کا اقتضائی اجلاس محترم راجہ گل نواز خاں صاحب پی۔سی ایس (ریٹائرڈ) کی صدارت میں ہوا۔ صاحب صدر نے قرآنی تصورِ حیات پر روشنی ڈالی اور ازاں بعد مخدوم نور محمد صاحب نے "رحمۃ للعالمین" کے موضوع پر تقریر کی۔ جملہ احباب نے بزم کی رکنیت قبول کرتے ہوئے بخلوصِ قلب فیصلہ کیا کہ وہ قرآنی فکر کے سلسلہ میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کریں گے اور اپنے حلقہ اثر میں اس روشنی کو آگے بڑھائیں گے۔ مخدوم نور محمد صاحب بزم کے نمائندے منتخب ہوئے۔ (ادارہ طلوع اسلام بزم کے قیام کی توثیق کرتا ہے)

گوجرانوالہ

۱۹ اکتوبر کے اجتماع میں گوجرانوالہ اور مضافات کے احباب نے شرکت کی۔ طلوع اسلام کے نو نئے خریدار بنائے گئے۔ بزم کے حلقہ میں نئے احباب کا اضافہ ہوا۔ لٹریچر کی تقسیم وسیع پیمانے پر جاری ہے۔

شیخوپورہ

"اسلامک آئیڈیالوجی" کی یکصد کاپیاں مختلف اصحاب میں تقسیم کی گئیں۔

حسام پور (ضلع ڈیرہ غازی خاں)

بزم تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول ہو رہی ہے۔ لٹریچر برائے مطالعہ طلب کیا جا رہا ہے۔ عوام مذہبی تفرقہ بازیوں سے نالاں ہیں اور طلوع اسلام کے قرآنی فکر کے متلاشی۔ سابق صدر بلدیہ محمد یوسف صاحب اور میاں ظہور احمد خاں کی ساعی جمیلہ سے قرآنی فکر کی روشنی آگے بڑھ رہی ہے

مری (ضلع راولپنڈی)

محترم ڈاکٹر حیات ملک یہاں سے سیالکوٹ تبدیل ہو گئے ہیں۔ ایمبیسڈر ہال میں ان کے اعزاز میں الوداعی اجتماع کا اہتمام کیا گیا۔ اور اس موقع پر اسلامک آئیڈیالوجی کے پمفلٹ کافی تعداد میں تقسیم کئے گئے۔

دیونہ منڈی (ضلع گجرات)

بزم کا قیام از سر نو عمل میں آیا۔ محمد اکبر صاحب بزم کے نمائندہ منتخب کئے گئے (ادارہ بزم کے از سر نو

قیام کی تصدیق کرتا ہے)

سید حسین (ضلع جہلم)
بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ کتابیں برائے مطالعہ دی جا رہی ہیں اور پمفلٹ تقسیم کئے جاتے ہیں۔

چنیوٹ (ضلع جھنگ)
۱۶ اکتوبر کو بزم کے اجلاس میں اجتماع راولپنڈی کی روئیداد اور فیصلوں سے سب کو آگاہ کیا گیا۔ طلوع اسلام کے تین نئے خریدار بنائے گئے۔

طلوعِ اسلام کے پُرانے پرچے

اگر کسی کو مندرجہ ذیل شماروں میں سے کسی کی ضرورت ہو تو چار آنہ فی رسالہ ڈاک خرچ ارسال کر کے طلب کر لیں جو پہلے آرڈر دیگا اس کا پہلے حق ہوگا۔

__ماہوار__:۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۳۸ء۔ نومبر ۱۹۳۹ء۔ فروری ۱۹۴۰ء۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء۔ جولائی ۱۹۴۹ء۔ جنوری، مارچ، جون، دسمبر ۱۹۵۱ء۔ مئی ۱۹۵۲ء۔ جون ۱۹۵۲ء۔ ستمبر ۱۹۵۳ء۔ جنوری، مئی، جولائی، اکتوبر، دسمبر ۱۹۵۴ء۔ جنوری ۱۹۵۵ء۔ فروری، نومبر ۱۹۵۶ء۔ اپریل، اگست، ستمبر کے دو میں، اکتوبر، نومبر (دو میں) ۱۹۵۷ء۔ مارچ (دو)، اپریل، مئی، جون، اگست، اکتوبر، دسمبر ۱۹۵۸ء۔ مارچ ۱۹۵۹ء۔

__ہفتہ وار__:۔ جلد ۸ شمارہ نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، (تین میں) ۱۸، ۲۱، ۲۲ (دو میں) ۲۳۔۲۴ (دو میں) ۲۸ (دو میں)، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۷، ۴۰، ۴۱ اور ۴۷ (دو میں) (خواجہ محمد حسین نمائندہ بزم طلوع اسلام حاجی پورہ۔ گوجرانوالہ)

ضرورتِ رشتہ

ضلع فیروزپور کے ایک تینتیس ۳۳ سالہ مہاجر راجپوت کے لئے جس کی پہلی بیوی بلا اولاد فوت ہو چکی ہے اور جو ضلع لاہور کے ایک اسکول میں ڈیڑھ صد روپے ماہوار پر بطور سینئر ہیڈ ماسٹر تعینات اور نو ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ اور جس کے بھائی اپنی اپنی جگہ برسر روزگار اور ہمشیرگان اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں، ایک رفیقہ حیات کی ضرورت ہے جو گھر کا انتظام سنبھال سکے۔ ذات پات اور تعلیم وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔ کنواری ہو یا بے اولاد بیوہ۔ لیکن قرآنی تصورِ حیات کی حامل ضرور ہو۔ مندرجہ ذیل پتہ پر لکھیں۔

ع۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور

ضرورتِ رشتہ

ایک جوان تعلیمیافتہ، صاحب سیرت و صورت۔ اور لاہور میں ایک بہت اچھے کاروبار کے واحد مالک کے لئے تعلیمیافتہ خوش شکل و خوش اخلاق ۲۵۔۳۰ سالہ رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے۔ بے اولاد بیوہ یا مطلقہ کو ترجیح دی جائیگی۔ خواہشمند پہلے ہی خط میں پوری تفصیل درج فرمائیں۔

م ۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔بی گلبرگ لاہور